عدیم ہاشمی

ترکش

ترکش

عدیم ہاشمی

ماورا پبلشرز۔ ۳ بہاولپور روڈ۔ لاہور

باذوق لوگوں کے لیے
ہماری کتابیں
خوبصورت کتابیں

تزئین و اہتمام اشاعت

خالد شریف

ماورا

ضابطہ

بار اوّل : ۱۹۹۲ء
خوشنویس : عبدالمتین
مطبع : پرنٹ مین، لاہور
تعداد : ایک ہزار

انتساب

ماں کے نام کہ جو میری عبادت ہے

رینو کے نام کہ جو میری محبّت ہے

انتسابؔ

شِدّت سے محبّت یا نفرت کرنے والوں کے نام

محبّت ہو کہ نفرت ہو بھرا رہتا ہوں شِدّت سے
جدھر سے آئے یہ دریا اُدھر ہی موڑ دیتا ہوں

دیباچہ

میری کتاب کو بہت پہلے آجانا چاہیے تھا۔

عدیم ہاشمی

حرفِ تشکّر

شُکر ہے پروردگار کا کہ جس نے مجھے شعر کہنے کی توفیق عطا فرمائی ۔
ممنون ہوں احمد ندیم قاسمی کا کہ جنھوں نے فنون میں میری تمام تر غزلوں کو محفوظ کیا ۔
ممنون ہوں ریاض احمد شاد کا کہ جس نے میری پھینکی ہوئی غزلوں کو اپنی چھت کے نیچے پناہ دی ۔
مشکور ہوں عارف محمود اور اشرف سلیم کا کہ جنھوں نے فنون میں سے میری غزلیں جمع کر کے مجھے صاحبِ کتاب بنانے کا کارنامہ انجام دیا ۔
مندرجہ بالا عوامل کارفرما نہ ہوتے تو یہ کتاب جو آج چَھپ گئی ہے کبھی نہ چَھپتی ۔

مزید برآں

مجھے یہ کہنے میں بہت خوشی محسوس ہوتی ہے کہ میں نے جن لوگوں کو دیکھ کر شعر کہنا سیکھا ہے وہ عہدِ حاضر کے منفرد اور ادبی طور پر بہت ہی صاحبِ حیثیت لوگ ہیں ۔ جن میں احمد ندیم قاسمی، شہزاد احمد، ناصر کاظمی، شکیب جلالی، ظفر اقبال اور قتیل شفائی جیسی مختلف الخیال شخصیات موجود ہیں ۔ پھر میرے اپنے ساتھی جن میں خالد احمد، نجیب احمد، امجد اسلام امجد، سرمد صہبائی، ریاض مجید شامل ہیں یہ میرے قصابوں جیسے دوست تھے جنھوں نے میرا کبھی لحاظ نہیں کیا ۔ اچھا شعر ہوا تو سر ہلا دیا اچھا نہ ہوا تو میرا دل ہلا دیا ۔ ان کے علاوہ بطورِ خاص افتخار نسیم جو میرا ساتھی بھی ہے اور مجھ سے ذرا سا بعد میں پیدا ہو کر بھی مجھ سے زیادہ اچھے شعر کہتا ہے میرا خاص محرک رہا ہے وہ اتنے اچھے شعر کہہ کر لاتا تھا کہ اس کے سامنے بُرا شعر کہنے کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی (یہ میرا اپنا خیال ہے ہو سکتا ہے جنھیں میں اچھے سمجھتا ہوں وہ بہت بُرے شعر ہوں) ۔ بس یوں ہے کہ اس کے سامنے اور اپنے مندرجہ بالا قصاب ساتھیوں کے سامنے اپنا بھرم رکھنے کے لیے مجبوراً "اچھے شعر" کہنا پڑتے تھے ۔

اِس کتاب میں میری بہت سی غزلیں شامل اشاعت نہیں ہیں اس لیے کہ میرے پاس اپنی کوئی غزل موجود نہ تھی ۔ میری کتاب کے نہ چھپنے کی بہت بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے اپنی غزلوں کو کبھی اس قابل نہ سمجھا تھا کہ وہ میری کتاب میں شامل ہو سکیں ۔ اب بھی جو کتاب میرے ذہن میں موجود ہے ۔ اس میں شائع ہونے والی اِن میں سے ایک غزل بھی نہیں ہے ۔ اِسی لیے شاید نہ تو میں نے کبھی کوئی بیاض بنائی اور نہ ہی غزلیں اپنے پاس جمع کیں ۔ یہ تو دوستوں کی محبّت ہے کہ انھوں نے میری یتیم کی ہوئی غزلوں کے سر پر ہاتھ رکھے رکھا ۔ ورنہ یہ کتاب بھی غیر مطبوعہ ہی رہ جاتی ـــــــ

آخر میں مَیں اپنے یار خالد شریف کا بھی بہت ممنون ہوں کہ اُس نے میری کتاب کو چھاپنے کی پیشکش کی ۔ ورنہ میں تو شاید کسی بھی پبلشر کو اپنی کتاب کی اشاعت کے لیے نہ کہہ سکتا ۔ بہرحال اب اس سے زیادہ شکریے بھی ٹھیک نہیں، لگتا ہے آدمی پبلک ریلیشننگ کر رہا ہے ۔

عدیم ہاشمی

ترتیب

- فاصلے ایسے بھی ہوں گے، یہ کبھی سوچا نہ تھا
سامنے بیٹھا تھا میرے اور وہ میرا نہ تھا

- وہ کہ خوشبو کی طرح پھیلا تھا میرے چار سُو
میں اسے محسوس کر سکتا تھا، چھُو سکتا نہ تھا

- رات بھر پچھلی ہی آہٹ کان میں آتی رہی
جھانک کر دیکھا گلی میں، کوئی بھی آیا نہ تھا

یہ سبھی ویرانیاں اُس کے جُدا ہونے سے تھیں
آنکھ دھُندلائی ہوئی تھی، شہر دھُندلایا نہ تھا

سینکڑوں طوفان لفظوں کے دبے تھے زیرِ لب
ایک پتّھر تھا خموشی کا کہ جو ہٹتا نہ تھا

آج اُس نے درد بھی اپنے علیحدہ کر لیے
آج میں غمگیں ہوا تو آج وہ رویا نہ تھا

یاد کر کے اور بھی تکلیف ہوتی تھی عدیم
بھول جانے کے سوا اب کوئی بھی چارہ نہ تھا

مصلحت نے اجنبی ہم کو بنایا تھا عدیم
ورنہ کب اک دوسرے کو ہم نے پہچانا نہ تھا

تعلق اپنی جگہ تجھ سے برقرار بھی ہے
مگر یہ کیا کہ ترے قرب سے فرار بھی ہے

یہی نہ ہو تری منزل، ذرا ٹھہر اے دل
وہی مکاں ہے، دیوں کی وہی قطار بھی ہے

یونہی تو روح نہیں توڑتی حصارِ بدن
ضرور اپنا کوئی بادلوں کے پار بھی ہے

میں پتھروں سے ہی سر کو پٹخ کے لوٹ آیا
چٹان کہتی رہی، مجھ میں شاہکار بھی ہے

یہ کیا کہ روک کے بیٹھا ہوا ہوں سیلِ ہوس
مچان پر بھی ہوں اور سامنے شکار بھی ہے

چھپا ہوا بھی ہوں جینے کی آرزو لے کر
پناہ گاہ مری، شیر کی کچھار بھی ہے

عدیمؔ اُس سے کروں بھی تو کس طرح کا سلوک
حریف بھی ہے وہ اپنا، وہ اپنا یار بھی ہے

۱۔ ٹوٹ جائے نہ بھرم ہونٹ ہلاؤں کیسے
حال جیسا بھی ہے لوگوں کو سناؤں کیسے

خشک آنکھوں سے بھی اشکوں کی مہک آتی ہے
میں ترے غم کو زمانے سے چھپاؤں کیسے

۲۔ تری صورت ہی مری آنکھ کا سرمایہ ہے
ترے چہرے سے نگاہوں کو ہٹاؤں کیسے

۳۔ تو ہی بتلا مری یادوں کو بھلانے والے
میں تری یاد کو اس دل سے بھلاؤں کیسے

۲۸ ـ پھول ہوتا تو ترے در پہ سجا بھی رہتا
زخم لے کر تری دہلیز پہ آؤں کیسے

آئینہ ماند پڑے سانس بھی لینے سے عدیمؔ
اِتنا نازک ہو تعلق تو نبھاؤں کیسے

وہ رُلاتا ہے رُلائے مجھے جی بھر کے عدیمؔ
مری آنکھیں ہے وہ میں اُس کو رلاؤں کیسے

○

مل گئی آپ کو فرصت کیسے
اتنی اچھی مری قسمت کیسے

پوچھ اُن سے جو بچھڑ جاتے ہیں
ٹوٹ پڑتی ہے قیامت کیسے

تری خاطر تو یہ آنکھیں پائیں
میں بھلا دوں تری صورت کیسے

اب تو سب کچھ ہی میسّر ہے اُسے
اب اُسے میری ضرورت کیسے

وہ تو خود سب کی تمنّا ہے عدیمؔ
اُس کے دل میں کوئی چاہت کیسے

—

○

سدا سفینۂ ہستی رواں دکھائی دیا
رُکے بھی ہم تو سفر کا سماں دکھائی دیا

تجھے نہ کیا مرے غم کا دُھواں دکھائی دیا
تو اِس جذبۂ دل میں کہاں دکھائی دیا

تنی تھی چادرِ شب رنگ، شہر کے سر پر
نکل کے گھر سے بھی کب آسماں دکھائی دیا

غموں کی دُھند کچھ ایسے جمی تھی آنکھوں میں
جدھر بھی دیکھا، دھواں ہی دھواں دکھائی دیا

ہمارے کرب کے لمحات بہہ سکے نہ کبھی
ہمیں نہ وقت کا دریا رواں دکھائی دیا

اُٹھا تھا دُور سمندر سے اَبر کا ٹکڑا
میں خوش ہوا کہ کوئی بادباں دکھائی دیا

اُدھر ہی بھاگ پڑا میں، جدھر غبار اُٹھا
ہر اک بگولا مجھے کارواں دکھائی دیا

پسِ اُفق بھی بجھے سورجوں کے ڈھیر ملے
وہ دن جو کوند گیا، پھر کہاں دکھائی دیا

* میں اپنے دل کی خوشی کی دُعائیں کیا مانگوں
یہی بہت ہے کہ تو شادماں دکھائی دیا

قدم تمام زمیں کا غبار چاٹ گئے
گئے ہوؤں کا نہ کوئی نشاں دکھائی دیا

وہیں خیال میں دل کا کھنڈر اُبھر آیا
جہاں گرا ہوا کوئی مکاں دکھائی دیا

پھر آج بھولے ہوئے غم نظر میں تیر گئے
پھر ایک بھٹکا ہوا کارواں دکھائی دیا

گرا ہوں دھوپ کے نیچے نڈھال ہو کے عدیمؔ
بڑی تلاش سے یہ سائباں دکھائی دیا

○

میرے رستے میں اشجار اُگایا کیجے
میں بھی انساں ہوں، مرے سر پہ بھی سایا کیجے

رات دن راہ میں آنکھیں نہ بچھایا کیجے
روشنی میں تو چراغوں کو بجھایا کیجے

آپ اِتنا تو مرے واسطے کر سکتے ہیں
آپ اُس شخص کی باتیں ہی سُنایا کیجے

ہاتھ میں جو ہے بہار، اُس کو تو آنے دیجے
کاغذوں پر تو ہرے پیڑ بنایا کیجے

راستے دھوپ سے پگھلے ہی چلے جاتے ہیں
آپ بادل ہیں تو پھر شہر پہ سایا کیجے

قیدِ تنہائی میں کیا آئے گی کوئی آواز
بیٹھ کر اپنی ہی زنجیر ہلایا کیجیے

جا چکا شہر سے وہ، اپنی اُداسی لے کر
عمر بھر اب در و دیوار سجایا کیجیے

لیجئے، توڑ گیا دم وہ صداؤں کا ڈسا
چیخئے اب کہ یہاں شور مچایا کیجیے

پھول کھلتے ہیں کہاں خشک چٹانوں میں عدیمؔ
راہ کے سنگ ہی آنکھوں سے لگایا کیجیے

○

غم کے ہر اک رنگ سے مجھ کو شناسا کر گیا
وہ، مرا محسن، مجھے پتھر سے ہیرا کر گیا

گھورتا تھا میں خلا میں تو سجی تھیں محفلیں
میرا آنکھوں کا جھپکنا، مجھ کو تنہا کر گیا

ہر طرف اُڑنے لگا تاریک سایوں کا غبار
شام کا جھونکا، چمکتا شہر میلا کر گیا

چاٹ لی کرنوں نے میرے جسم کی ساری نمی
میں سمندر تھا، وہ سورج مجھ کو صحرا کر گیا

ایک لمحے میں بھرے بازار سونے ہو گئے
ایک چہرہ سب پرانے زخم تازہ کر گیا

میں اُسی کے رابطے میں جس طرح ملبوس تھا
یوں وہ دامن کھینچ کر مجھ کو برہنہ کر گیا

رات بھر ہم روشنی کی آس میں جاگے عدیمؔ
اور دن آیا تو آنکھوں میں اندھیرا کر گیا

○

آغوشِ ستم میں ہی چھُپا لے کوئی آکر
تنہا تو تڑپنے سے بچا لے کوئی آکر

صحرا میں اُگا ہوں کہ مری چھاؤں کوئی پائے
ہلتا ہوں کہ پتوں کی ہوا لے کوئی آکر

کشتی ہوں مجھے کوئی کنارے سے تو کھولے
طوفاں کے ہی کر جائے حوالے کوئی آکر

جب کھینچ لیا ہے مجھے میدانِ ستم میں
دل کھول کے حسرت بھی نکالے کوئی آکر

دو چار خراشوں سے ہو تسکینِ جفا کیا
شیشہ ہوں تو پتھر پہ اُچھالے کوئی آکر

میرے کسی احسان کا بدلہ نہ چکائے
اپنی ہی وفاؤں کا صلہ لے کوئی آکر

اتنا تو ہو، پتھرائے ہوئے اشک پگھل جائیں
اپنا ہی مجھے درد سُنا لے کوئی آکر

ہر سر ہے یہاں زخم، ہر اک ہاتھ ہے پتھر
اس شہر میں کس کس کو سنبھالے کوئی آکر

گر جائیں نہ جاگی ہوئی راتیں مرے سر سے
تھوڑا سا تو یہ بوجھ اُٹھا لے کوئی آکر

سر کو نہ عدیمؔ آکے کوئی شخص سنبھالے
دیوار ہی گرنے سے بچا لے کوئی آکر

○

۳۔ ایسا بھی نہیں، اس سے ملا دے کوئی آکر
کیسا ہے وہ، اِتنا تو بتا دے کوئی آکر

یہ بھی تو کسی ماں کا دُلارا کوئی ہوگا
اس قبر پہ بھی پھول چڑھا دے کوئی آکر

۴ سُوکھی ہیں بڑی دیر سے پلکوں کی زبانیں
بس آج تو جی بھر کے رُلا دے کوئی آکر

برسوں کی دُعا پھر نہ کہیں خاک میں مل جائے
یہ ابر بھی آندھی نہ اُڑا دے کوئی آکر

یہ کوہ، یہ سبزہ، یہ مچلتی ہوئی ندیاں
مر جاؤں جو منزل کا پتا دے کوئی آکر

ہر گھر پہ ہے آواز، ہر اک در پہ ہے دستک
بیٹھا ہوں کہ مجھ کو بھی صدا دے کوئی آکر

اس خواہشِ ناکام کا خوں بھی مرے سر ہے
زندہ ہوں کہ اس کی بھی سزا دے کوئی آکر

○

*میں گفتگو ہوں کہ تحریر کے جہان میں ہوں
مجھے سمجھ تو سہی، میں تری زبان میں ہوں

خود اپنی سانس کہ رُکتی ہے اپنے چلنے سے
یہ کیا گھٹن ہے! میں کس تنگ سے مکان میں ہوں

گزر رہی ہے مرے سر سے گاہکوں کی نگاہ
ذراسی چیز ہوں لیکن بڑی دُکان میں ہوں

مرے قریب سے گزرا نہیں ہے سنگ تراش
مجسمہ ہوں مَیں، اب تک مگر چٹان میں ہوں

عدیمؔ بیٹھا ہوا ہوں پَروں کے ڈھیر پہ میں
خوش اس طرح ہوں کہ جیسے کسی اُڑان میں ہوں

○

رختِ سفر یونہی تو نہ بیکار لے چلو
رستہ ہے دھوپ کا، کوئی دیوار لے چلو

طاقت نہیں زباں میں تو لکھ ہی لو دل کی بات
کوئی تو ساتھ صورتِ اظہار لے چلو

دیکھوں تو وہ بدل کے بھلا کیسا ہو گیا
مجھ کو بھی اُس کے سامنے اک بار لے چلو

کب تک ندی کی تہہ میں اُتارو گے کشتیاں
اب کے تو ہاتھ میں کوئی پتوار لے چلو

پڑتی ہیں دل پہ غم کی اگر سلوٹیں تو کیا
چہرے پہ تو خوشی کے کچھ آثار لے چلو

جتنے بھنور کھوگے، پہن لوں گا جسم پر
اک بار تو ندی کے مجھے پار لے چلو

کچھ بھی نہیں اگر تو ہتھیلی پہ جاں سہی
تحفہ کوئی تو اس کے لیے یار لے چلو

جنگل میں آئے گا کوئی گاہک کہاں عدیمؔ
بکنا ہے گر تو ساتھ خریدار لے چلو

○

شور سا ایک، ہر اک سمت بپا لگتا ہے
وہ خموشی ہے کہ لمحہ بھی صدا لگتا ہے

خوف ایسا کہ ہوا پر بھی ہے سکتہ طاری
شاخ پر پھول بھی ٹھہرا ہوا لگتا ہے

چیخ، اُٹھتی ہوئی ہر گھر سے نظر آتی ہے
ہر مکاں شہر کا، آسیب زدہ لگتا ہے

آنکھ ہر راہ سے چپ ہی چلی جاتی ہے
دل کو ہر موڑ پہ کچھ کھویا ہوا لگتا ہے

کتنا حاسد ہوں کہ اک تو ہی مرا اپنا ہے
اور تو ٹھیک سے ہنستا بھی بُرا لگتا ہے

میرے احساس نے ساون میں گنوائی ہے نظر
مجھ کو سوکھا ہوا جنگل بھی ہرا لگتا ہے

سوچتا ہوں تو ہر انسان پرانی صُورت
دیکھتا ہوں تو ہر اک شخص نیا لگتا ہے

اپنا احساس کہ رہتا ہوں کھنڈر میں جیسے
شہر اپنا کہ زمینوں میں دبا لگتا ہے

دیر سے ڈھونڈ رہا ہوں فقط اک شب کی پناہ
صاف انکار ہر اک در پہ لکھا لگتا ہے

جان تُو کس کے لیے اپنی گنواتا ہے عدیمؔ
خُوبصورت ہے وہ لیکن ترا کیا لگتا ہے

٭ اُسے تشبیہ کا دُوں آسرا کیا
وہ خود اِک چاند ہے پھر چاند سا کیا

اُلٹ جاتی ہے صورت آئینے میں
دکھائے گا حقیقت آئینہ میں

برہنہ ہو گئے ہیں زخم کیا کیا
سویرا شامِ غم کا ہو گیا کیا؟

٭ قیامت ہو گیا چلنا بھی مجھ کو
پلٹ کر دیکھنا بھی تھا نرا کیا

زباں احساس کی سُوکھی ہوئی تھی
بدلتا موسموں کا ذائقہ کیا

۷ ــ بہت نزدیک آتے جا رہے ہو
بچھڑنے کا ارادہ کر لیا کیا ؟

پلٹ کر آ گئے گزرے زمانے
تمہارا نام کاغذ پر لکھا کیا

تھی محسوس آنکھیں ہو رہی ہیں
نہ جانے آنسوؤں میں بہہ گیا کیا

۷ ــ بڑے محتاط ہوتے جا رہے ہو
زمانے نے تمھیں سمجھا دیا کیا

ــ کسے تکتے ہوئے پتھرا گئے ہو
خلاؤں میں تمہارا کھو گیا کیا؟

بڑے رنگین سپنے آ رہے ہیں
عدیمؔ اس نیند سے اب جاگنا کیا

(نذرِ غالب)

○

ہلے نہ ہونٹ ترے قُرب کے بیاں کے لیے
یہ ذائقہ ہی نیا تھا مری زباں کے لیے

میں کون کون سے دیوار و در کو یاد کروں
دھڑک رہا ہے مرا دل تو ہر مکاں کے لیے

ہر ایک کرب مرے ہی نصاب میں تو نہیں
یہ کیا کہ میں ہی چُنا جاؤں امتحاں کے لیے

کہاں لکھوں کہ نہ پہنچے جہاں پہ وقت کا ہاتھ
قدم کہاں پہ دھروں دائمی نشاں کے لیے

مہک مٹے گی غموں کی کب اے ہوائے چمن
کھلا ہوا ہوں میں کس موسمِ خزاں کے لیے

نہ اب وہ اپنی تمنّا، نہ تیری خواہشِ خاص
میں جی رہا ہوں یہ کس عمرِ رائیگاں کے لیے

خلا میں پھینک رہا ہوں جلا جلا کے چراغ
بنا رہا ہوں ستارے کچھ آسماں کے لیے

درخت پہنوں بدن پر، سنوار لوں شاخیں
کہ پیڑ ڈھونڈ رہا ہے وہ آشیاں کے لیے

ذرا نہ ٹوٹ سکا بحرِ بے رواں کا سکوت
ہوا چلی ہی نہیں اپنے بادباں کے لیے

بس اِک سفید سی تصویر بن گئی ہے عدیم
ملے نہ رنگ مجھے اپنی داستاں کے لیے

O

تجھ کو سُننے سے تو انکار نہیں ہے کوئی
اب مجھے خواہشِ اظہار نہیں ہے کوئی

در و دیوار سے اُٹھتی ہیں کراہیں کیسی
اب تو گھر میں مرے بیمار نہیں ہے کوئی

پَیر کر آیا ہوں تجھ کو کہ کٹے تنہائی
اے ندی، تیرے بھی اِس پار نہیں ہے کوئی

مجھ کو یہ ہے کہ کہیں بوجھ نہ تم پر بن جاؤں
ساتھ چلنے سے تو انکار نہیں ہے کوئی

کچھ نہ کچھ صَرف بھی ہونا ہے ملاقاتوں پر
صرف ملنا اُسے دُشوار نہیں ہے کوئی

میں ہی کیوں پاؤں میں زنجیرِ تعلق رکھوں
جب کسی کا بھی گرفتار نہیں ہے کوئی

۷ • میں ہی کیوں آؤں ہمیشہ ترے دروازے تک
تیرے رستے میں بھی دیوار نہیں ہے کوئی

اور بھی لوگ مرے حلقۂ احباب میں ہیں
ایک تُو ہی تو مِرا یار نہیں ہے کوئی

اپنی خواہش کے تقاضے ہیں مقدّم مجھ کو
تجھ سے تو دستِ سروکار نہیں ہے کوئی

بے غرض خون کے رشتے بھی نہیں آج عدیم
یہ گلہ کیا کہ ترا یار نہیں ہے کوئی

○

- اِدھر بھی دیکھ کبھی اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے
ہم آج بھی ہیں تری رہگذر میں بیٹھے ہوئے

عجیب شکلیں بناتی رہی ہے تنہائی
میں ڈر گیا تھا خود اپنے ہی گھر میں بیٹھے ہوئے

- کھُلی ہے آنکھ مگر نیند ٹوٹتی ہی نہیں
وہ خواب تھے کہ ہیں اب تک نظر میں بیٹھے ہوئے

چمک رہا ہے ترا شہر جگنوؤں کی طرح
کہ ہیں ستارے مری چشمِ تر میں بیٹھے ہوئے

- بچھڑ کے تجھ سے، نہ دیکھا گیا کسی کا ملاپ
اُڑا دیے ہیں پرندے شجر میں بیٹھے ہوئے

– چھپا ہوا ہوں کہ سب شغل پوچھتے ہیں مرا
وگرنہ کٹتا ہے کب وقت گھر میں بیٹھے ہوئے

کروں بھی کام کہاں اپنی سطح سے، گر کر
کہ آشنا ہیں مرے شہر بھر میں بیٹھے ہوئے

ازل سے گھوم رہا ہوں بس ایک محور پر
میں تھک گیا ہوں زمیں کے بھنور میں بیٹھے ہوئے

ڈری ہوئی ہے مکانوں کی خِشت خِشت عدیم
عجیب لوگ ہیں دیوار و در میں بیٹھے ہوئے

---

[1] انگریزی میں IN THE TREE اور ON THE TREE دونوں طرح سے استعمال ہوتا ہے مجھے اردو میں بھی شجر پہ بیٹھے ہوئے کی نسبت شجر میں بیٹھے ہوئے کا تصور زیادہ اچھا لگا اس لئے استعمال کر دیا ہے۔

○

نجانے کیا تھا کہ جو کھو گیا اُڑانوں میں
بھٹک رہی ہے نظر کب سے آسمانوں میں

کٹی ہے صبح تلک کروٹیں بدلتے ہوئے
کوئی سسکتا رہا جیسے میرے کانوں میں

کہ جیسے سب کا ہی پیارا بچھڑ گیا ہو کوئی
عجیب شور تھا اُس شہر کے مکانوں میں

یہاں تو ایک سے ہے ایک بڑھ کے سنگ مثال
میں آ گیا ہوں کہاں گھومتی چٹانوں میں

اُڑا رہی ہیں سبھی دھجّیاں سفر کا مذاق
ہوا ٹھہرتی نہیں آ کے بادبانوں میں

وہ خوف تھا کہ میں ٹھہرا گیا تھا بیٹھے بٹھائے
جو پھڑ پھڑائے پرندے بھی آشیانوں میں

یہ کیسا حکم، مرے بادشاہ! تو نے دیا
سزائیں ایسی تو سنتے تھے داستانوں میں

حباب پھوڑ رہے ہو، یہ سیپیاں تو نہیں
گہر کہاں ہیں ہواؤں کے ان خزانوں میں

اچانک آج ملے ہیں تو لگ رہا ہے عدیم
کہ جیسے تیر پلٹ آئے ہوں کمانوں میں

ہوگئی دیوار کچھ، در اور ہی کچھ ہوگیا
دیکھتے ہی دیکھتے گھر اور ہی کچھ ہوگیا

اجنبی کہنا مناسب ہے کہاں اُس شخص کو
وہ تو مجھ سے دُور جا کر اور ہی کچھ ہوگیا

فیصلے نے اور ہی الفاظ موزوں کر لیے —
سوچتے تھے اور ہی، پر اور ہی کچھ ہوگیا

دُور کا دھوکا ہی نکلیں اُس کی ساری سختیاں
ہاتھ لگتے ہی وہ پتّھر اور ہی کچھ ہوگیا

اور ہی منظر تھا، اُس کو چھوڑنے جب آئے تھے
جا چکی گاڑی تو منظر اور ہی کچھ ہوگیا

پھر نظر کو پیاس کی شدّت نے دھوکا دے دیا
[illegible]

٭

۷) دُکھ نہیں اُس کا کہ وہ تو ٹھیک ہے اپنی جگہ
دُکھ ہے یہ، اپنا مقدّر اور ہی کچھ ہو گیا

اور ہی محشر تھا گھر میں قید تھا جب اپنا آپ
حشر برپا گھر کے باہر اور ہی کچھ ہو گیا

کیا ترے دن رات ساکت ہو گئے ہیں اے زمیں
یا پھر اب تیرا بھی محور اور ہی کچھ ہو گیا

فاصلوں کے پیرہن اُس نے اُتارے کیا عدیمؔ
وہ مرے نزدیک آ کر اور ہی کچھ ہو گیا

○

بسکہ اک ایسی کمی سارے سفر میں رہ گئی
جیسے چلتے وقت کوئی چیز گھر میں رہ گئی

کون یہ چلتا ہے میرے ساتھ بے جسم و صدا
چاپ یہ کس کی، مری ہر رہگزر میں رہ گئی

گو سنجتے رہتے ہیں تنہائی میں بھی دیوار و در
کیا صدا اُس نے مجھے دی تھی کہ گھر میں رہ گئی

آ رہی ہے اب بھی دروازے سے اُن ہاتھوں کی باس
جذب ہو کر جن کی ہر دستک ہی در میں رہ گئی

اور تو موسم گزر کر جا چکا وادی کے پار
بس ذرا سی برف ہر سُو کھڑے شجر میں رہ گئی

رات دریا میں پھر اک شعلہ سا چکراتا رہا
پھر کوئی جلتی ہوئی کشتی بھنور میں رہ گئی

کچھ تو آئی ہے خلاؤں میں بھی خوشبوئے زمیں
خوش ہوں، کچھ تو گردِ میرے بال و پر میں رہ گئی

رات بھر ہوتا رہا ہے کن خزانوں کا نزول
موتیوں کی سی جھلک ہر برگِ تر میں رہ گئی

لوٹ کر آئے نہ کیوں جاتے ہوئے لمحے عدیم
کیا کمی میری صدائے بے اثر میں رہ گئی

دِل کھنچا رہتا ہے کیوں اُس شہر کی جانب عدیم
جانے کیا شے اُس کی گلیوں کے سفر میں رہ گئی

○

کب یہ پرواز کا سودا مرے سر سے نکلے
جب بھی دیکھا ہے فلک، باہوں میں پر سے نکلے

رات دن بڑھتی گئیں نخلِ سفر کی شاخیں
کتنے رستے تھے جو اک راہگذر سے نکلے

رنگ و روغن کے تلے تھی وہی مٹی، وہی ریت
جھانک کر دیکھا تو سب گھر ہی کھنڈر سے نکلے

پاؤں سے کٹ نہ سکی راہ کی زنجیر کبھی
گھر پہنچ کر بھی نہ ہم قیدِ سفر سے نکلے

جان لیوا ہی سہی ہے تو نظارہ دلچسپ
کاش کچھ دیر تو کشتی نہ بھنور سے نکلے

خشک شاخوں میں یہ رنگوں کا خزانہ کیسا
پھول لے لے کے یہ کیا ہاتھ شجر سے نکلے

آؤ دیکھیں تو سہی، رات کا آسیب ہے کیا
یہ بھی کیا خوف کہ کوئی بھی نہ گھر سے نکلے

ٹوٹ بھی جائے کسی طرح فصیلوں کا حصار
قافلہ کوئی تو اس شہر کے در سے نکلے

گھنٹیاں گونج اُٹھیں رات کے سنّاٹے میں
پھر شرارے کسی جلتے ہوئے گھر سے نکلے

اور بھی دیکھ ہی لُوں کیا ہے مرے پیشِ نظر
کسی صورت ترا چہرہ تو نظر سے نکلے

یوں بھی دیکھا ہے پسِ سلسلۂ کوہ عدیم
ابھی سُورج نہیں نکلا کہ شرر سے نکلے

○

مفاہمت نہ سکھا جبرِ ناروا سے مجھے
میں سربکف ہوں، لڑا دے کسی بلا سے مجھے

زباں نے جسم کا کچھ زہر تو اُگل ڈالا
بہت سکون ملا تلخئ نوا سے مجھے

رچا ہوا ہے بدن میں ابھی سُرورِ گناہ
ابھی تو خوف نہیں آئے گا سزا سے مجھے

میں خاک سے ہوں، مجھے خاک جذب کر لے گی
اگرچہ سانس ملے عمر بھر ہوا سے مجھے

غذا اسی میں مری، میں اسی زمیں کی غذا
صدائیں آتی ہیں کیوں قریۂ خلا سے مجھے

میں جی رہا ہوں ابھی، اے زمینِ آدم خور
ابھی تو دیکھ نہ تو اتنی اشتہا سے مجھے

بکھر چکا ہوں میں، اب مجھ کو مجتمع کر لے
تُو اب سمیٹ بھی اپنی کسی صدا سے مجھے

میں مر رہا ہوں، پھر آئے صدائے کُن فیکوں
بنایا جائے مٹا کے پھر ابتدا سے مجھے

میں سر بسجدہ ہوں، اے شمر! مجھکو قتل بھی کر
رہائی دے بھی اب اس عہدِ کربلا سے مجھے

۳ میں کچھ نہیں ہوں تو پھر کیوں مجھے بنایا گیا
یہ پوچھنے کی اجازت تو ہو خدا سے مجھے

میں ریزہ ریزہ بدن کا اُٹھا رہا ہوں عدیم
وہ توڑ ہی تو گیا اپنی التجا سے مجھے

۴ میں خود ہوں خود کو بنانے بگاڑنے والا
عدیمؔ کوئی شکایت نہیں خدا سے مجھے

○

تمام عمر کی تنہائی کی سزا دے کر
تڑپ اٹھا مرا منصف بھی فیصلہ دے کر

مرے خدا، یہ برہنہ لباس پوش ہیں کون
عذاب کیا یہ دیا مجھ کو چشمِ وا دے کر

میں اب مروں کہ جیوں، مجھکو یہ خوشی ہے بہت
اُسے سکوں تو ملا مجھ کو بد دُعا دے کر

کیا پھر اُس نے وہی، جو خود اُس نے سوچا تھا
بُرا تو میں ہی بنا اُس کو مشورہ دے کر

میں اُس کے واسطے سورج تلاش کرتا ہوں
جو سو گیا مری آنکھوں کو رتجگا دے کر

وہ رات رات کا مہماں تو عمر بھر کے لیے
چلا گیا مجھے یادوں کا سلسلہ دے کر

جو وا کیا بھی دریچہ تو آج موسم نے
پہاڑ ڈھانپ دیا ابر کی ردا دے کر

کٹی ہوئی ہے زمیں کوہ سے سمندر تک
ملا ہے گھاؤ یہ دریا کو راستہ دے کر

چٹخ چٹخ کے جلی شاخ شاخ جنگل کی
بہت سرور ملا آگ کو ہوا دے کر

پھر اس کے بعد پہاڑ اُس کو خود پکاریں گے
تو لوٹ آ، اُسے وادی میں اک صدا دے کر

ستونِ ریگ نہ ٹھہرا عدم کی چھت کے تلے
میں ڈھے گیا ہوں خود اپنے کو آسرا دے کر

۳ ہوا نہیں کہ جسے دیکھ ہی نہ پاؤں گا
وہ جسم ہے تو اُسے ہاتھ بھی لگاؤں گا

ڈھلا بسنت کا دن باندھ لُوں گا چاند سے ڈور
میں اب کے رات بھی ساری پتنگ اُڑاؤں گا

بہت پسند ہیں پھول اور تتلیاں اُس کو
میں اب گیا تو پرندوں کے پر بھی لاؤں گا

۴ جو خواہشیں تھیں مٹا کر حنوط کر لی ہیں
اب اہتمام سے اہرامِ دل سجاؤں گا

مری حیات زمیں سے نہ یوں دھکیل مجھے
میں آسماں پہ گروں گا تو ٹوٹ جاؤں گا

شجر شجر سے لپٹ کر مجھے پکارو گے
جب آئی دھوپ سروں پر، میں یاد آؤں گا

کوئی جگہ تو ہے اس کائنات سے بھی پرے
سفر میں ہوں تو وہاں بھی قدم جماؤں گا

یہ آسماں مری چھت مہر و مہ دریچے مرے
انہی کو پھاند کے آیا انہی سے جاؤں گا

نباہنے کے تصوّر سے شرمسار نہ ہو
میں صرف اپنے تعلّق کو آزماؤں گا

وہ مِل گیا تو اُسے گالیاں بھی دوں گا عدیم
گلے لگا کے اُسے حال بھی سناؤں گا

٥

کہتا ہے کون انجمن آرائی چاہیے
تنہائی چاہیے' مجھے تنہائی چاہیے

جو کچھ میں دیکھتا ہوں، کہیں وہم ہی نہ ہو
میرے سوا بھی کوئی تماشائی چاہیے

یہ کیا کہ میری آنکھ میرے ساتھ ہو
تنہائی میں اِک اور بھی تنہائی چاہیے

۳ رکھ اپنے پاس اپنی سبھی نیک نامیاں
اے دل! بُرا ہوں مَیں، مجھے رُسوائی چاہیے

زنجیرِ عدل! اب تو مِرے ہاتھ چِھل گئے
اب تو مِری پکار کی شنوائی چاہیے

۲ بارات ہو کوئی کہ جنازے کا ہو ہجوم
بازار کو تو رونق و رعنائی چاہیے

فرشِ خلا پہ ناچتی رہتی ہے کیوں زمیں
اس بیسوا کو کیسا تماشائی چاہیے

لڑتے ہیں کب کسی کیلئے دوسروں کے ہاتھ
اپنے ہی بازوؤں میں توانائی چاہیے

پانی نہیں، لہو کا پیالہ ہے میری مانگ
واقف نہیں عدیمؔ مجھے بھائی چاہیے

○

یوں دکانوں پر ضمیروں کی فراوانی نہ تھی
لوگ بکتے تھے مگر اتنی بھی ارزانی نہ تھی

فیصلے سے قبل تم اس کو مٹا سکتے بھی تھے
خط کا جملہ تھا، کوئی تحریرِ پیشانی نہ تھی

جسم گر جانے کا خدشہ تھا، مکاں کا ڈر نہ تھا
جتنے طوفاں دل میں تھے، رات اتنی طوفانی نہ تھی

حیرت اس پر تھی کہ دیوارِ بدن ٹھہری رہی
شہر کے مسمار ہو جانے کی حیرانی نہ تھی

سبزہ و گُل کھٹکھٹاتے بھی اگر در کو تو کیا
گھر کی ویرانی تھی یہ، جنگل کی ویرانی نہ تھی

رات بھر ہم دوسروں کو آئینے دیتے رہے
صبح جب آئی تو شکل بھی پہچانی نہ تھی

آنکھ کو شکوہ کہ کوئی رنگ مطلب کا نہ تھا
دل کو یہ لالچ کہ پھر یہ زندگی آنی نہ تھی

کچھ تو تھا اُس میں کہ جس کا اک جہاں محتاج تھا
ورنہ اتنی خلق یارو کوئی دیوانی نہ تھی

آنکھ میں پانی تھا، بستی تو نہیں تھی زیرِ آب
درد کا طوفاں تھا یہ، دریا کی طغیانی نہ تھی

جنگلوں میں بھی نظر آئے بہت سُوکھے شجر
درد و غم کی صرف شہروں میں فراوانی نہ تھی

کس جگہ دل نے تری یادوں کی محکومی نہ کی
کونسا خطّہ تھا جس پر تیری سُلطانی نہ تھی

حکمرانی کیوں بسی تھی اُس کی نَس نَس میں عدیم
عام سی لڑکی تھی، محلوں کی تو وہ رانی نہ تھی

○

میں ابھی زندہ ہے، سسکتا ریت کے ٹیلوں میں تھا
اضطراب اِک پھر بھی منڈلاتی ہوئی چیلوں میں تھا

کیا ہوا آئی کہ منظر ریزہ ریزہ ہو گیا
نصب کیسا آئینہ ٹھہری ہوئی جھیلوں میں تھا

اُٹھ رہی تھی تیرگی میں ایسے کرنوں کی پھوار
زرد فوارہ کوئی جس طرح قندیلوں میں تھا

برف نے شیشہ گری کر دی تھی ہر کہسار پر
آئینہ ہی آئینہ بکھرا ہُوا میلوں میں تھا

ذہن پر یوں چھوٹی چھوٹی خواہشیں تھیں حملہ زن
جیسے گھائل، پر پُنچا شاہیں ابابیلوں میں تھا

روندتے جاتے تھے اپنے ہی تقاضے جسم کو
میں گِرا میداں میں اپنی فوج کے فیلوں میں تھا

ہر صدا پیڑوں کی شاخوں سے اُلجھ کر رہ گئی
گرد جنگل بھی مِرے پھیلا ہُوا میلوں میں تھا

یا مِری آنکھوں میں کندہ ہو گئے تھے تیرے نقش
یا ترا چہرہ منوّر ساری قندیلوں میں تھا

ہو چکا جو ہو چکا جو دن گیا وہ دن گیا
اب دھرا ہی کیا، گئے لمحوں کی تفصیلوں میں تھا

جسم تھا مصلوب چوراہے کی سُولی پر عدیم
ہر سفر کا درد پیروں کی گڑی کیلوں میں تھا

○

وہ ابر تھے کہ برس کر بھی رات بھر نہ کھلے
سحر ہوئی بھی مگر روشنی کے در نہ کھلے

میں موج موج سے لپکا بھی ساحلوں کی طرف
بندھے ہوئے تھے بدن سے جو، وہ بھنور نہ کھلے

بھرے ہجوم میں تنہا بس ایک میں ہی تو تھا
مرے ہی ساتھ فقط میرے ہمسفر نہ کھلے

میں جان کر بھی اُسے بڑھ رہا ہوں اس کی طرف
سراب دیکھ کے بھی چشمِ بے خبر نہ کھلے

بدن جلاتی رہی خشک شاخ کی چھاؤں
بہار بیت گئی، جو ہر شجر نہ کھلے

عقاب دیکھ کے پتھرا گیا میں اُڑتے ہُوئے
زمیں پہ ٹوٹ گیا، گر کے میرے پَر نہ کھُلے

زمیں پہ بیٹھ گیا ہوں میں آشیاں لے کر
مرے لیے تو کہیں بازوئے شجر نہ کھُلے

مگر بندھی ہی رہی کوہِ سبز کی گٹھڑی
جھلستے پاؤں پہ چھاؤں کے یہ سفر نہ کھُلے

وہ سامنے مرے بھیگا ہُوا کھڑا ہے عدیم
کچھ اور دیر ابھی کاش، چشمِ تر نہ کھُلے

اے خدا! اب اس زمیں کو قہر سے خالی بھی کر
تُو نے اس مٹّی کو جاں دی ہے، تو رکھوالی بھی کر

قحط کے دن کب تلک اُگلیں گے نیرِ آفتاب
اِس اُفق پر اب ہویدا صبحِ خوشحالی بھی کر

دیکھ کر بنجر زمینیں، اب تو آنکھیں چھل گئیں
خُشکیاں تُو نے عطا کی ہیں تو ہریالی بھی کر

اِتنا کچھ تُو نے بنایا، خالِق کون و مکاں!
آنکھ اک پیدا، دُکھوں کو دیکھنے والی بھی کر

اے شفق! اب آسماں پر پھینک تاروں کے چراغ
خون کی ہولی جو کھیلی ہے تو دیوالی بھی کر

بے ہُنر ہاتھوں سے محرابِ فلک پر کیا بناؤں
رنگ بخشے ہیں تو میرا ذہن تمثالی بھی کر

مجھ کو کن بونے حریفوں کے مقابل کر دیا
دشمنی دی ہے تو ان کے حوصلے عالی بھی کر

دیکھ دیکھ اس کو تو اب آنکھیں بھی خیرہ ہو گئیں
اس چمکتی دوپہر کی شکل مٹیالی بھی کر

چاند تاروں کی چمک میں تو نہیں چھپتا بدن
رات دی ہے مجھ برہنہ کو۔ اسے کالی بھی کر

انتظار اب اور کیا ہے ، بھیج اپنی آفتیں
بھر گئی ہے ظلم سے دُنیا، اسے خالی بھی کر

یوں عدیمؔ اپنی اَنا کو چھوڑنا اچھا نہیں
یہ بلا تُو نے جو پالی ہے تو رکھوالی بھی کر

—

٢۔ اِک کھلونا ٹوٹ جائے گا، نیا مل جائے گا
ہیں نہیں تو کوئی تجھ کو دُوسرا مل جائے گا

۔ بھاگتا ہوں ہر طرف ایسے ہوا کے ساتھ ساتھ
جس طرح سچ مچ مجھے اس کا پتا مل جائے گا

کس طرح روکو گے اشکوں کو پسِ دیوارِ چشم
یہ تو پانی ہے، اسے تو راستہ مل جائے گا

ایک دن تو ختم ہو گی لفظ و معنی کی تلاش
ایک دن تو مجھ کو میرا مدّعا مل جائے گا

— ایک دن تو اپنے جھوٹے خول کو توڑے گا وہ
ایک دن تو اس کا دروازہ کھُلا مل جائے گا

جا رہا ہوں اس یقیں سے اس کے چھوڑے گھر کی سمت
جیسے وہ باہر گلی میں جھانکتا مل جائے گا

چھوڑ خالی گھر کو، آ باہر چلیں گھر سے عدیم
کچھ نہیں تو کوئی چہرہ چاند سا مل جائے گا

تیز ہوتی جا رہی ہیں دھڑکنیں ایسے عدیم
جیسے اگلے موڑ پر وہ بے وفا مل جائے گا

○

دُعا کرے بھی، بناؤ، کوئی اثر کیسے
شجر ہی جب نہ اُگے تو لگے ثمر کیسے

یہ کیا کہ اس کو سُنانے سے ہو وضاحتِ حال
مجھے خبر ہے تو وہ مجھ سے بے خبر کیسے

وہ جس نے پیدا کیا، وہ کرے حفاظت بھی
مجھے، تلاطمِ حالات! تیرا ڈر کیسے

میں چل پڑوں تو ستارے بھی میرے پاؤں کی دھول
جب آدمی ہوں تو محتاجِ بال و پر کیسے

یہ کس خیال کے لشکر کا خیر مقدمِ خاص
فصیلِ ذہن میں کھُلنے لگے ہیں در کیسے

A.S. چڑھا ہوں چھت پہ تو مینار بھی نظر آئے
چھُپا دیے تھے گھروں نے خدا کے گھر کیسے

گزر رہے ہیں یہ کیا غول اُڑتے لمحوں کے
نکل پڑے ہیں رُکی ساعتوں کے پر کیسے

نکل رہے ہیں مری ایڑیوں سے رستے کیا
چھُپے ہوئے ہیں مرے پاؤں میں سفر کیسے
یہ خشکیاں ہیں تو چکرا رہا ہوں میں کیوں کر
یہ خاک ہے تو یہاں پڑ گئے بھنور کیسے

ملے بغیر اسے ، دل کو کیسا اطمینان
بغیر دیکھے اسے ، بھر گئی نظر کیسے
اِدھر بھی دیکھ کسی سنگ کے تراشے ہوئے!
تجھے خبر ہو کہ ہوتی ہے آنکھ تر کیسے

مجھی میں ہیں مری سب قوتیں اگر پنہاں
تو کھٹکھٹاؤں کسی اور کا میں در کیسے
بڑی ہی زرد لکیریں بنیں مٹیں شب بھر
دکھائے رنگ ستاروں نے تا سحر کیسے
عدیمؔ تُو نے اُسے کیا کہا تھا ، یاد تو کر
وہ اُٹھ گیا ترے پہلو سے رُوٹھ کر کیسے

عدیمؔ آب و ہوا بھی فریب ہی نکلی
کہ بیج بوئے تھے کیا ، اُگ پڑے شجر کیسے

○

کھیتوں پہ آگ بن کے سحاب آئے تو ہے کم
دوزخ کا اس زمیں پہ عذاب آئے تو ہے کم

ہر روز لوگ بن کے کبوتر، حیات پائیں
ہر روز ان کے سر پہ عقاب آئے تو ہے کم

سر پر ہر ایک شخص کے ایک ایک آفتاب
ہر روز مثلِ روزِ حساب آئے تو ہے کم

اتنی غلاظتیں ہیں کہ دھونے کو ذہن ذہن
سیلِ خلا بھی صورتِ آب آئے تو ہے کم

شب سے بھی ہے سیاہ یہاں تیرہ باطنی
آنکھوں میں آفتاب کی تاب آئے تو ہے کم

دستِ ہوس چھڑے گا کہاں خارِ نرم سے
نیزہ بھی کوئی زیرِ گلاب آئے تو ہے کم

بزدل ہیں یہ کہ زخم لگا ہی نہیں انھیں
یاں پھول کا بھی سنگ جواب آئے تو ہے کم

اِن موذیوں پہ قہرِ الٰہی کی شکل میں
نمرود سا بھی خانہ خراب آئے تو ہے کم

دو چار باد گرد نہیں قیمتِ نمو
اُڑ کر زمیں بھی سُوئے سحاب آئے تو ہے کم

اے خونِ برق رو! تری رفتار کی قسم
سو بار بھی جو عہدِ شباب آئے تو ہے کم

اب تو ہر اِک سوال تجلّی مثال ہے
اب آسمان سے بھی جواب آئے تو ہے کم

تیرا لکھا کرے گا یہاں کیا اثر عدیم
یاں جبرئیل لے کے کتاب آئے تو ہے کم

○

نوائے تُند کے پتّھر بہت اُچھالوں گا
یہ آئینہ ہے فلک تو میں توڑ ڈالوں گا

میں سوچتا ہوں، ترا کیا بنے گا بارِ حیات!
ابھی تو زور میں ہوں، میں تجھے اُٹھالوں گا

فرازِ کوہ کا پانی ہوں، بند باندھو گے کیا
میں چل پڑوں گا تو خود راستے بنالوں گا

مرا وہ دشمنِ جاں پنجہ آزما بھی تو ہو
میں اپنے آپ کو کب تک یونہی سنبھالوں گا

زمیں تو ہاتھ پہ رکھی ہوئی ہے گیند کی مثل
وہ جس جگہ بھی چھُپے ڈھونڈ ہی نکالوں گا

وجودِ خاک ہوں میں، مجھ کو فکرِ فصل ہے کیا
جہاں بچھوں گا وہیں پھول پھل اُگالوں گا

اُگا ہُوا ہے مرے ہاتھ پر اناج مرا
میں کشتِ غیر کی خیرات کیسے کھاؤں گا

۳۔ ہے شرط یہ کہ کھُلے بازوؤں سے آئے کوئی
وہ دشمنی بھی کرے تو گلے لگاؤں گا

کوئی تو چیز تری دسترس سے باہر ہے
میں اپنا نام تو ہر حال میں بچاؤں گا

عدیم وسعتیں میری خلاؤں جیسی ہیں
وہ چاند ہے، اُسے آغوش میں چھپا لوں گا

○

سَو ڈھنگ نمٹنے کے میں ایجاد کروں گا
میں تو نہ ترے قہر کی فریاد کروں گا

چیخیں بھی ترے قصر کی محراب سے اُٹھیں
کچھ درد بھی میں شاملِ بنیاد کروں گا

فرعون مرے تخت پہ اُتریں گے کہاں تک
کب تک میں یونہی بیعتِ شدّاد کروں گا

میں مملکتِ دل کا جو حاکم ہوں تو اس میں
جو ظلم کرے گا اسے برباد کروں گا

اب تو دلِ وحشی درِ اخلاق میں ہے بند
اُس وقت سے ڈر جب اُسے آزاد کروں گا

میں خود بھی توانا مرے بازو بھی ہُنرمند
میں اپنے کھنڈر آپ ہی آباد کروں گا

صد دامِ صفت میرا تو اپنا ہے نشیمن
میں کیسے بھلا شکوۂ صیاد کروں گا

یہ عرض و گزارش تو غلامانہ ادا ہے
میں ہونٹ ہلاؤں گا تو ارشاد کروں گا

مرضی کے مطابق تو تراشوں گا خد و خال
پیدا بدنِ سنگ سے اولاد کروں گا

مر کر ہی سہی، رونقِ خانہ تو بڑھے گی
میں جمع تو کچھ شہر کے افراد کروں گا

اے روح، رہائی تو مرے بس میں نہیں ہے
کچھ کم تو تری قید کی میعاد کروں گا

تو کیسے بچے گا مجھے رسوائیاں دے کر
تجھ کو بھی تو میں شاملِ روداد کروں گا

دے گا جو خوشی، دوں گا عدیمؔ اُسکو ہی خوشیاں
ناشاد کرے جو اُسے ناشاد کروں گا

○

درِ خدا پہ بھی جا کر سوال کیا کرنا
جو مانگنے سے ملے وہ کمال کیا کرنا

خباثتوں کے گلے پر کہاں کی تکبیریں
جو شے حرام ہے اس کو حلال کیا کرنا

نکل پڑے ہو تو پھر سمت کا تعیّن کیا
سفر کو قیدِ جنوب و شمال کیا کرنا

فلک نیا نہ سہی پاؤں تو نئے ہیں مرے
پرانی کاہکشاں پائمال کیا کرنا

بس ایک دانۂ گندم بہت ہے دامن میں
شکارِ نوعِ بشر ہے تو جال کیا کرنا

اب آنے والی قیامت کی فکر کر پیارے
گزر گئی ہے جو اس کا ملال کیا کرنا

یہ زندگی تو بدن میں پرانا دھن ہے عدیمؔ
اب اس کی اتنی کڑی دیکھ بھال کیا کرنا

عدیمؔ موت تو برحق ہے یہ تو آئے گی
پھر اس کے خوف سے جینا محال کیا کرنا

○

- کیا ہے اُس پار، یہ منظر بھی دکھایا جائے
یہ جو پردہ ہے، اسے اب تو ہٹایا جائے

کس طرح ہار گئے، رازِ شکست افشا ہو
ہم پہ کیا بیت گئی، ہم کو بتایا جائے

گھاؤ آئے ہیں کہاں شکل کہاں سے بگڑی
آئینہ اب تو ہمیں کوئی دکھایا جائے

بُوزنے ہیں تو ملے ہم کو ہمارا جنگل
آدمی ہیں تو مداری سے چھڑایا جائے

سگِ خانہ ہیں تو مالک سے کریں عہدِ وفا
خشتِ ہر سمت سے تو خود کو بچایا جائے

کب تلک صرف غلاموں ہی کے در پر دستک
قصرِ آقا کا بھی دروازہ ہلایا جائے

عملِ پس قدمی ختم کیا جائے عدیمؔ
قدم آگے ہی، بس آگے ہی بڑھایا جائے

کوئی آواز تو پہنچے گی فلک پار عدیمؔ
آؤ مل جل کے ذرا شور مچایا جائے

○

ہم اس لیے تو حریفوں کی چال میں آئے
وہ گرگ تھے مگر انساں کی کھال میں آئے

عبور اب کے کیا تھا طویل دشتِ فراق
مزے بھی اب کے بہت ہی وصال میں آئے

جبینِ یار عرق سے سبک کروں کیسے
اُسے مزہ ہی مرے انفعال میں آئے

وہ ہے جو عادل و منصف تو پھر لحاظ یہ کیا
وہ مہرباں ہے تو کیوں اشتعال میں آئے

رحیم ہے تو کرے رحم ہم غریبوں پر
ہے ذوالجلال تو کھُل کر جلال میں آئے

جواب کرتا پھرے جمع ریزہ ہائے وجود
کچھ اس طرح کی تو شدّت سوال میں آئے

تمام عمر کا ہے ساتھ آب و ماہی کا
پڑے جو وقت تو پانی نہ جال میں آئے

چھپا ہُوا ہے کوئی شیر ہی درونِ دماغ
کہ جب بھی آئے، ہرن ہی خیال میں آئے

گرو تو ساتھ گرے شانِ شہسواری بھی
کمال کوئی انوکھا زوال ہی آئے

اک ایسی ضرب لگا پشتِ آسماں پہ عدیم
کہ نور جھڑ کے محیطِ سفال میں آئے

کچھ ایسے کھینچ زمیں کو مدار میں کہ عدیم
پلٹ کے عہدِ گزشتہ بھی حال میں آئے

تو جہاں کی، یہ جہاں تیری، عدیمؔ! اولاد ہے
کائیاں تُو بھی ہے، دنیا بھی بڑی اُستاد ہے

آسمانوں سے زمیں کی سمت لٹکے ہیں مکان
چاند تارے ہیں کہ مُلک اُلٹا کوئی آباد ہے

بے زمیں قائم ہیں تیرے ثابت و سیّار کیوں
کیوں مِرا ہر اک مکاں منّت کشِ بنیاد ہے

ذہن وہ عیّاش، غم سے بھی اُٹھائے لذّتیں
اور دل وہمی کہ خوشیاں پا کے بھی ناشاد ہے

تو کہاں جائے گی مجھ کو چھوڑ کر اے خودسری
میرا ویرانہ ترے دم سے ہی تو آباد ہے

سب ملاقاتی سلاخوں سے اُدھر جیسے ہوں قید
اور قیدی کو یہ خوش فہمی کہ وہ آزاد ہے

مسلسل

یہ جو پُتلا سا پڑا ہے راہ میں، اس کو اُٹھا
پوچھ اس سے، پاس اس کے کونسی روداد ہے

چکھ اسے، اس میں بھی لذّت ہے وہی جو تجھ میں ہے
ذائقہ اس کا بھی خاک و خون کی ایجاد ہے

سُونگھ، اس میں سے بھی آئے گی پسینے کی مہک
چھُو اسے، پتّھر نہیں ہے، یہ بھی آدم زاد ہے

دیکھ، یہ مظلوم ہے، اب توڑ ڈالے گا کواڑ
سُن، ترے در پہ یہ اس کی آخری فریاد ہے

جھانک کر باہر تسلّی اپنی کچھ کر لے عدیمؔ
دل ہی چیخا ہے کہ یہ سیلِ صدائے باد ہے

سب لوگ اگر بگڑ گئے ہیں
ہم کس کے لیے اُجڑ گئے ہیں

خالی ہیں سب آسماں کی شاخیں
تاروں کے چراغ جھڑ گئے ہیں

سُورج ہے کہ زخم آسماں ہے
نیزے سے فلک میں گڑ گئے ہیں

آئی وہ دراڑ زلزلے سے
کہسار اُدھڑ اُدھڑ گئے ہیں

دریا کی یہ تیزیاں ہیں کیسی
پانی میں شگاف پڑ گئے ہیں

مرنا بھی نہ آ سکا ہمیں تو
زندہ ہی زمیں میں گڑ گئے ہیں

کشکول بنے ہوئے بڑھے تھے
دامن کی طرح سکڑ گئے ہیں

افلاک سپر کھڑی ہے دُنیا
ہستی کے قدم اُکھڑ گئے ہیں

آپس میں عدؔیم کب ملے تھے
ہم جو یہ کہیں، بچھڑ گئے ہیں

○

۱ تری تخلیق نے بدلے ہیں یہ عنواں کیسے
تنِ انساں میں اُچھلنے لگے حیواں کیسے

تُو نے تو اعلیٰ و اشرف کا شرف بخشا تھا
گِر کے پاتال تک آیا ترا انساں کیسے

کون مخلوقِ غلط کار کو دے گا کشتی
نوح جب کوئی نہیں ہے تو یہ طوفاں کیسے

تن گئی آ کے سمندر کی یہ چادر کیوں کر
ہٹ گیا سر سے مرے سایۂ یزداں کیسے

آج سورج نہیں، پانی ہے سوا نیزے پر
سج گیا سر پہ مرے، حشر کا میداں کیسے

کس نے آباد گھروندوں کو کھنڈر کر ڈالا
بس گئے شہر کی گلیوں میں بیاباں کیسے

اپنے ہاتھوں سے جہاں تُونے کیا ہے آباد
اپنے ہاتھوں سے کریگا اسے ویراں کیسے

میرا انسان بھٹکتا تو کوئی بات نہ تھی
راستہ بھُول گیا ہے ترا انساں کیسے

روح پر کتنی خراشیں ہیں تری سانسوں کی
زندگی! اور اٹھاؤں ترے احساں کیسے

کتنے وحشی نکل آئے ہیں سرِ عام عدیمؔ
کھُل گیا فطرتِ آدم کا یہ زِنداں کیسے

یہ نبوت کا زمانہ تو نہیں کوئی عدیمؔ
دل میں اُبھری ہوسِ تختِ سلیماں کیسے

زندگی موت سے بدتر تو ہوئی جاتی ہے عدیمؔ
پھر بھی حیرت ہے کہ جینے کے ہیں ارماں کیسے

مثال پاؤں کے ساکت نشان جیسی ہے
تھکان مجھ کو، سفر کی تھکان جیسی ہے

اُڑا ہوں باندھ کر افلاک اپنی باہوں سے
مری اُڑان، مری ہی اُڑان جیسی ہے

لگاؤں پھول تو کھیتوں میں چاند اُگتے ہیں
زمیں بھی میری عدیمؔ آسمان جیسی ہے

تجھے جو دیکھ لیا ہے، اب اور کیا دیکھوں
تو ایک شکل ہی سارے جہان جیسی ہے

ہُوا ہی کیا جو رویّہ مرا ہے سنگ شکن
عدیمؔ ضد بھی تو اُس کی چٹان جیسی ہے

ہوائیں بھی در و دیوار بن گئی ہیں عدیمؔ
گھٹن کھُلے میں بھی اب تو مکان جیسی ہے

Scanned by CamScanner

خدا بھی عبد کی صورت مرے جہان میں ہے
وہ ممتحن ہے مگر آپ امتحان میں ہے

میں بڑھ رہا ہوں بہ سُوئے بلندیٔ افلاک
کہ پستیوں کی طرف یہ جہان اُڑان میں ہے

اب اپنی آنکھ بچا، مجھ کو گھُورنے والے!
نظر بھی تیز مری، تیر بھی کمان میں ہے

ہر ایک سنگ کی نبضوں پہ ہاتھ کیا رکھنا
میں جانتا ہوں کہ جو زلزلہ چٹان میں ہے

عدیمؔ خشت کے انبار کی حفاظت کیا
یہ دیکھ لے کہ مکیں بھی کوئی مکان میں ہے

○

جلتا رہا ہوں رات کی تپتی چٹان پر

سورج نہ تھا جیسے چاند نہ تھا آسمان پر

اک روگ ہے کہ جاں کو لگا ہے اُڑان کا

ٹوٹا ہوا پڑا ہوں پَروں کی دکان پر

میں راستوں میں اُس کا لگاؤں کہاں سراغ

سو سو قدم ہیں ایک قدم کے نشان پر

کہ زمیں ہیں یا زمیں کو پکڑنے کا کوئی جال

سورج ہے یا شکاری کوئی آسمان پر

بادل سے کھیلتی رہیں پختہ عمارتیں

بجلی گری تو شہر کے کچے مکان پر

اُس تند خو کو راہ میں ٹھہرا لیا ہے کیا

پانی عدیمؔ روک لیا ہے ڈھلان پر

یوں منہ میں ذائقہ ہے اس اک بات کا عدیمؔ

جیسے وہ لفظ لکھے گئے ہوں زبان پر

○

ہزار حشر بپا موجۂ نفس میں رہے ہے
عدیمؔ پھر بھی ہمیں تھے جو اپنے بس میں رہے ہے

اٹھی جو رات تو دن جھک گیا فلک بن کر
قفس بکھر بھی گیا، پھر بھی ہم قفس میں رہے ہے

بندھا ہوا تھا جو دھاگا، نہ پاؤں سے ٹوٹا
اُڑے بھی ہم تو شکاری کی دسترس میں رہے ہے

بہت ہی رینگ کے گزری ہے غم کے زنداں میں
صدی صدی کچے سے لمحے برس برس میں رہے ہے

قریب آ کے سبھی منزلیں گزرتی گئیں
عدیمؔ محو ہمیں نالۂ جرس میں رہے ہے

○

غم کی شدّت جا بجا انبار کی صُورت نہ تھی
گھر کی ویرانی، کبھی بازار کی صُورت نہ تھی

فاصلے پہلے بھی ہوتے تھے، نظر آتا تھا وہ
اُس کی رنجش یوں کبھی دیوار کی صورت نہ تھی

سانس پہلے بھی رواں تھی، یوں گلا کٹتا نہ تھا
زندگی تھی تو، مگر تلوار کی صورت نہ تھی

اتنی شدّت سے مجھے اُس شخص نے مانگا عدیم
دشمنی کے باوجود انکار کی صورت نہ تھی

لوٹ کر آیا تو سارا شہر ویراں تھا عدیم
سب وہی چہرے تھے، اپنے یار کی صورت نہ تھی

○

ڈھلتی ہے دھوپ ورنہ جاتا ہوں جان سے
سورج کی سمت جکڑا ہوا ہوں چٹان سے

جھانکو تو فاصلوں کے سمندر ہیں درمیاں
دیکھو تو ہر مکان جڑا ہے مکان سے

میں نے تو رتجگوں کی بہت سیڑھیاں بنائیں
وہ چاند ہی نہ اُترا مگر آسمان سے

بیٹھا رہا وہ پاس ہی میرے، کنارِ آب
ٹکرا کے ٹوٹتی رہیں لہریں چٹان سے

تنگ آ کے خود ہی نوچ لیے اپنے پر عدیمؔ
دل مطمئن ہوا نہ کسی بھی اُڑان سے

——

○

قید ہوں تنہا خموشی کے در و دیوار میں
ہونٹ پتھر ہو گئے ہیں خواہشِ گفتار میں

میں نگاہیں گاڑنے میں دیر سے مصروف ہوں
چھید ہوتا ہی نہیں ہے رات کی دیوار میں

ایک میرے ہی مصائب کا گلا کٹتا نہیں
تیز یاں یوں تو بہت ہیں وقت کی تلوار میں

آج ہی کچھ کم ہوئی تھی اُس کی یادوں کی خلش
آج ہی وہ شخص مجھ کو مل گیا بازار میں

دل کو عادت ہو گئی ہے ٹوٹ جانے کی عدیم
اب کہاں وہ خوف باقی ہے کسی انکار میں

—

O

پھر معلّق ہیں وہی آنکھیں نظر کے سامنے
پھر وہی دیوار قائم ہے سفر کے سامنے

یاد ہیں اب بھی مجھے، اُس کی گھنی چھاؤں کے دن
پھول اُگا آیا ہوں اُس سوکھے شجر کے سامنے

ایسے خائف کر گئے ہیں آشنائی کے فریب
دیر سے سہما کھڑا ہوں اپنے گھر کے سامنے

پھر نظر آنے لگی ہے ایک قدرِ مشترک
پھر مَیں لے آیا ہوں خود کو اک کھنڈر کے سامنے

فیصلہ تقدیر کا تسلیم کرنا پڑ گیا
آپ آ کر رُک گئی کشتی بھنور کے سامنے

بانٹتا کوئی نہیں تنہائیاں میری عدیمؔ
میں اکیلا پھر رہا ہوں شہر بھر کے سامنے

—

○

کیا قہر ہے نازل، یہ سجھائی نہیں دیتا
مظلوم بھی ظالم کی دہائی نہیں دیتا

کیسی ہے مرے دَور کی یہ کور نگاہی
آنکھیں بھی ہیں اور پھر بھی دکھائی نہیں دیتا

بیمار کی چیخوں سے فلک گونج اُٹھا ہے
یہ شور معالج کو سنائی نہیں دیتا

ہے سارے زمانے سے انوکھا مِرا منصف
تکمیلِ سزا پر بھی رہائی نہیں دیتا

بے چشم جہاں عدل ہے، بے گوش ہے عادل
میں ایسی عدالت کو صفائی نہیں دیتا

اِک شور سنائی مجھے دیتا تو ہے لیکن
کیا شور ہے ، یہ صاف سنائی نہیں دیتا

جانے وہ پیمبر کہ منافق ہے ، جواب بھی
بدلے میں بُرائی کے ، بُرائی نہیں دیتا

کچھ اور بھی لوگوں پہ عدیمؔ اُس کے کرم ہیں
نمرود کو وہ صرف خدائی نہیں دیتا

آ کے دیکھو تو کبھی تم مری ویرانی میں
کتنے سامان ہیں اس بے سر و سامانی میں

آج بھی دیکھ لیا اُس نے کہ میں زندہ ہوں
چھوڑ آیا ہوں اُسے آج بھی حیرانی میں

رات بھر تا بہ سحر شاخِ اُفق خالی تھی
چاند پھر ڈوب گیا تھا تری پیشانی میں

ساتھ دینا ہے تو دے چھوڑ کے جانا ہے تو جا
تو اضافہ تو نہ کر میری پریشانی میں

آسمانوں کی طرف جیسے اُلٹ جائیں مکان
عکس ایسے ہی نظر آئے مجھے پانی میں

یوں تو بجھنے کو بچھی چادرِ سیلاب مگر
لہر کچھ اور بھی عریاں ہوئی طغیانی میں

خلعتِ گرد اُتاری تو مقابل میں تھا
آئینہ ڈوب گیا پردۂ حیرانی میں

دھوپ نکلے گی تو کہسار ہی پگھلیں گے عدیم
برف جتنی تھی وہ سب بہہ گئی طغیانی میں

جی میں جادو ہی جگاتی چلی جاتی ہے عدیم
جانے کیا شے ہے نہاں صورتِ انسانی میں

ایک سے طوق ہیں سب کے، تری سُلطانی میں
فرق آزاد میں کوئی ہے نہ زندانی میں

وہی معمار کہ تعمیر اُٹھانا تھی جنہیں
وہی شامل ہیں مرے شہر کی ویرانی میں

اس قدر زور تھا بپھری ہوئی طغیانی میں
ناؤ اُلٹی تو مکاں تیر گئے پانی میں

آ کے دیکھو تو پگھلتے ہوئے کچّے در و بام
گھر سے نکلو تو کبھی موسم بارانی میں

ہڈیاں تن میں سلاخوں کی طرح لٹکی ہیں
یہ عجب فرق ہے اس عہد کے زندانی میں

اب ہواؤں سے ترے جبر کی آنچ آتی ہے
تپشِ آتشِ دوزخ ہے خنک پانی میں

سانس لینے کا بھی تاوان لیا ہے اُس نے
آئے تھے ہم تو عدیمؔ اُس کی نگہبانی میں

جھانک اِک بار کسی دل کی پریشانی میں
عمر کٹ جائے گی ساری ترِی حیرانی میں

کوئی پوشاک میں عُریاں نظر آتا ہے عدیمؔ
اور کوئی ہے کہ چھُپ جاتا ہے عُریانی میں

کٹ ہی گئی جدائی بھی، کب یہ ہُوا کہ مر گئے
تیرے بھی دن گزر گئے، میرے بھی دن گزر گئے

تیرے لیے چلے تھے ہم، تیرے لیے ٹھہر گئے
تو نے کہا تو جی اُٹھے، تو نے کہا تو مر گئے

وقت ہی کچھ جدائی کا اِتنا طویل ہو گیا
دل میں ترے وصال کے جتنے تھے زخم بھر گئے

تو بھی کچھ اور اور ہے، ہم بھی کچھ اور اور ہیں
جانے وہ تو کدھر گیا، جانے وہ ہم کدھر گئے

ہوتا رہا مقابلہ پانی کا اور پیاس کا
صحرا اُمڈ اُمڈ پڑے، دریا بپھر بپھر گئے

وہ بھی غبارِ خاک تھا، ہم بھی غبارِ خاک تھے
وہ بھی کہیں بکھر گیا، ہم بھی کہیں بکھر گئے

کوئی کنارِ آب جو بیٹھا ہوا ہے سرنگوں
کشتی کدھر چلی گئی جانے کدھر بھنور گئے

آج بھی انتظار کا وقت حنوط ہو گیا
ایسے لگا کہ حشر تک سارے ہی پل ٹھہر گئے

بارشِ وصل وہ ہوئی ، سارا غبار دُھل گیا
وہ بھی نکھر نکھر گیا ، ہم بھی نکھر نکھر گئے

آبِ محیطِ عشق کا بحر عجیب بحر ہے
تَیرے تو غرق ہو گئے ، ڈوبے تو پار اُتر گئے

اتنے قریب ہو گئے اپنے رقیب ہو گئے
وہ بھی عدیمؔ ڈر گیا ، ہم بھی عدیمؔ ڈر گئے

اُس کے سلوک پر عدیمؔ اپنی حیات و موت ہے
وہ جو ملا تو جی اُٹھے ، وہ نہ ملا تو مر گئے

اور ہے اپنی کہانی اور ہے
لیکن اُس کو بدگمانی اور ہے

یوں تو ہر طوفان کا پانی اور ہے
پھر بھی آنکھوں کی روانی اور ہے

دل پہ جو بیتی کہانی اور ہے
داستاں اُس کو سنانی اور ہے

ریگِ صحرا میں سفینہ کیا چلاؤں
اس سمندر کا تو پانی اور ہے

میں تو سویا تھا ستارے اوڑھ کر
یہ ردائے آسمانی اور ہے

اجنبی! اک پیڑ بھی ہے سامنے *—
اُس کے گھر کی اِک نشانی اور ہے

— پھول بھی لینا چلوں کچھ اپنے ساتھ
اُس کی اِک عادت پرانی اور ہے

ڈھونڈتا ہے عکس تُو کِس وقت کے
اب تو اس ندی کا پانی اور ہے

یوں دبائے جا رہا ہوں خواہشیں
جیسے اِک عہدِ جوانی اور ہے

پار جانے کا ارادہ تھا عدیمؔ
آج دریا کی روانی اور ہے

—

جس قدر چھُپنے کی کوشش کی ، اکارت ہوگئی
جو بھی کمزوری تھی ، چہرے پر عبارت ہوگئی

مَیں غلاظت میں بہت خوش تھا کہ سب جیسا تھا میں
اے تقدس ، کیوں مجھے تیری زیارت ہوگئی

کس قدر کنجوسیوں سے جمع کی تھی دوستی
کس فراوانی سے یہ دولت بھی غارت ہوگئی

اب تو سچی بات کوئی لُطف دیتی ہی نہیں
جھُوٹ میں یاروں کو کچھ ایسی مہارت ہوگئی

تھا برونِ چشم تو سُورج بھی اندھا تھا عدیم
آنکھ میں اُتری تو ظلمت بھی بصارت ہوگئی

O

میں گر رہا تھا شبنمیں گوہر بنا ہوا
وہ سامنے کھڑا تھا گُل تر بنا ہوا

مجھ میں ہی تابِ تندیٔ بادِ وفا نہ تھی
تھا وہ تو میرے ساتھ مرے پَر بنا ہوا

تیرے تو، اے مکان! مکیں آ ہی جائیں گے
میں کس کے واسطے ہوں کھُلا در بنا ہُوا

گھیرے ہوئے ہیں مجھکو بگولے بھنور کی مثل
صحرا مرے لیے ہے سمندر بنا ہُوا

منڈلا رہے ہیں سر پہ غموں کے سیہ عقاب
دبکا ہوا ہوں گھر میں کبوتر بنا ہُوا

ہے شام اور لوٹ رہے ہیں گھروں کو لوگ
میں ہوں، سفر ہے میرا مقدّر بنا ہُوا

الہام تیرا کون سمجھتا ہے یاں عدیمؔ
تُو کیسے دَور کا ہے پیمبر بنا ہُوا

تعبیر بن کے، دیکھا ہوا خواب آ گیا
جس باب سے بچے تھے، وہی باب آ گیا

انساں کی آنکھ خشک تھی انساں کے ظلم پر
اب جو پہاڑ روئے تو سیلاب آ گیا

اپنی طرف چلا ہوں تو چمکی ہے یوں زمیں
پیروں میں جیسے قریۂ مہتاب آ گیا

پھر آج دشمنوں کی تمنّا ہوئی عدیمؔ
پھر سے خیالِ حلقۂ احباب آ گیا

آنکھوں کی سیپیوں میں تو کچھ بھی نہ تھا عدیمؔ
دل کے صدف میں گوہرِ نایاب آ گیا

کچھ شکستہ کشتیاں، کچھ ہاتھ سطحِ آب پر
کیا کشیدہ کاریاں تھیں چادرِ سیلاب پر

جیسے تودہ برف کا چھیلے بدن کہسار کا
اس طرح کا قہر بھی ٹوٹا دلِ شاداب گل پر

رات کی دیوار پر تارے منقّش ہو گئے
سنگ ہم نے بھی سجائے آنکھ کی محراب پر

بھولتا کیسے بھلا نانہ پرانے وقت کا
ہنس بیٹھا ہی رہا سُوکھے ہوئے تالاب پر

جب بھی چاہے آ کے لے لے اپنے پل پل کا حساب
نقش ہے ہر رات میرے دیدۂ بے خواب پر

خشک تھے دن کی تمازت میں بھی ہریالی کے ہونٹ
رات بھی شبنم نہ اُتری سبزۂ بے تاب پر

چوٹیاں اُونچی ہوئیں اتنی کہ بنجر ہو گئیں
ہو گئے پتّھر مسلّط وادیٔ شاداب پر

روز اک سورج اُتر جاتا ہے لہروں میں عدیمؔ
کس طرح قابو سمندر کو رہے اعصاب پر

ہر شکن میں کچھ نہ کچھ نکلا ہوا ہو گا عدیمؔ
جھُرّیاں یونہی نہیں ہیں چہرۂ گرداب پر

وقت نے چھوڑی نہیں ہے زندگی خوری عدیمؔ
سُرخیٔ خوں روز اُبھرتی ہے شفق کے باب پر

○

اِک اُچھلتی لہر میں پہلے کنارا چھپ گیا
یہ جہاں پھر ڈوبنے والے سے سارا چھپ گیا

ہر گلی کوچے میں ننگے سر پھری بیچارگی
جھانک کر ہر در کے پیچھے سے سہارا چھپ گیا

پُتلیاں بن کر ستارے دن کی رہ تکتے رہے
اور دن آیا کچھ ایسے، ہر ستارہ چھپ گیا

روشنی اتنی اُمڈ آئی کہ نیلی ہو گئی
سورج اتنے زور سے چمکا کہ سارا چھپ گیا

نفرت ایسی آگ جو دیوار و در جھُلسا گئی
پیار وہ بچّہ کہ جو دہشت کا مارا چھُپ گیا

دیکھتی آنکھوں پہ پٹّی بندھ گئی دیوار کی
دو کواڑوں کے اُدھر گھر اُس کا سارا چھپ گیا

چند ناپختہ و پختہ ڈھیریاں سی رہ گئیں
جو زمیں کی گود میں چہرہ اُتارا، چھپ گیا

اس قدر بارش کہ جیسے وصلِ ارض و آسماں
تخلیہ اتنا، جہاں سارے کا سارا چھپ گیا

وہ خوشی کا ثانیہ تھا یا چھلاوہ تھا عدیمؔ
سامنے آیا، رُکا، مجھ کو پکارا، چھپ گیا

○

ہو کر بدن سے رُوح جدا ، سامنے رہی
وہ شکل یوں مثالِ سزا سامنے رہی

ٹوٹے دیے سے پھُوٹ بھی زرد سی لکیر
پھر اس کے بعد تیز ہَوا سامنے رہی

آنکھیں بجھیں ، چراغِ سماعت چمک اُٹھے
صُورت چھُپی تو اُس کی صدا سامنے رہی

بے پردگی کسی کی بھی دیکھی نہ جا سکی
میں کیا کروں کہ تیری رِدا سامنے رہی

ہر انتقام اُس کے ستم کا ہوا تمام
اُس نے جو کی تھی ایک وفا، سامنے رہی

شاخِ اُفق سے ٹوٹ کے سورج کہاں گرا
دیکھا نہ جا سکا کہ گھٹا سامنے رہی

آنکھوں کی پُتلیوں پہ حنا جم گئی عدیمؔ
اُس کی ہتھیلیوں کی دُعا سامنے رہی

—

○

- وہ ایک جس کے لیے ہم نے گھر ہی چھوڑ دیا
اُس ایک شخص نے قصدِ سفر ہی چھوڑ دیا

وہ لوگ پھول تھے، آغوش تھی زمین تو کیا
وہ لوگ چھوڑ دیے، وہ نگر ہی چھوڑ دیا

- وہ آندھیاں تھیں کہ ڈھیلی پڑی مکاں کی گرفت
وہ زور تھا کہ مرے گھر نے در ہی چھوڑ دیا

معاوضہ سا لگے پت جھڑوں کے بعد کے دن
لگے جو پھول تو ہم نے شجر ہی چھوڑ دیا

فلک فلک ہے قفس ہی قفس اُڑانوں کا
اسی لیے تو عزمِ بال و پر ہی چھوڑ دیا

اِسی لیے تو ہر اِک پل ملاپ رہتا ہے
عدیمؔ ہم نے بچھڑنے کا ڈر ہی چھوڑ دیا

وہ جس کے ساتھ سفر کی حکائیتیں بنتیں
عدیمؔ اُس نے سرِ رہگذر ہی چھوڑ دیا

○

- چھید جو بھی تھا چھتوں کے درمیاں، کھُلتا گیا
ایک بارش سے، مکینوں پر مکاں کھُلتا گیا

اِس زمین و آسماں کے فاصلے بڑھتے گئے
جیسے جیسے اِس زمیں پر آسماں کھُلتا گیا

مجھ سے دامن کھینچ کر بنتا گیا وہ مجھ پہ بھید
اور سب دُنیا سے میرا رازداں کھُلتا گیا

خوف کی زردی میں چہرے اور بھی عُریاں ہوئے
اُڑ گیا تو اور رنگِ دشمناں کھُلتا گیا

رات کی گٹھڑی کھُلی تو شہر ننگے ہو گئے
صبح کی آنکھوں پہ سارا ہی جہاں کھُلتا گیا

ایک ہی کنکر سے چادر کائی کی چھلنی ہوئی
دائرہ در دائرہ آبِ نہاں کھُلتا گیا

وہ کہ جیسے دھوپ میں پیوند سائے کا عدیمؔ
چھاؤں بجھتی ہی گئی، وہ سائباں کھُلتا گیا

اور بھی لہریں ہوئیں منہ زور دُنیا کی عدیمؔ
اور اپنی زندگی کا بادباں کھُلتا گیا

حلق میں گرہیں پڑی تھیں دل سُلگنے سے عدیمؔ
قطرہ قطرہ آنسوؤں میں سب دُھواں کھُلتا گیا

۱۔ جو دیا تو نے ہمیں، وہ صورتِ زر رکھ لیا
تُو نے پتّھر دے دیا تو ہم نے پتھر رکھ لیا

۲۔ سبھوں نے چار سُو دیکھا، کوئی ڈھارس نہ تھی
ایک تنہائی تھی، اُس کی گود میں سر رکھ لیا

۳۔ داستانیں لوگ بھی گھر کی سناتے تھے بہت
نام ہم نے بھی در و دیوار کا گھر رکھ لیا

گھُٹ گیا تہذیب کے گنبد میں ہر خواہش کا دم
جنگلوں کا مور ہم نے گھر کے اندر رکھ لیا

۴۔ میری پلکوں پر جما دی گرم صحراؤں کی دھُول
اپنی آنکھوں کے لیے اُس نے سمندر رکھ لیا

درزتک سے اب نہ پھوٹے گی تمنّا کی پھوار
چشمۂ خواہش پہ ہم نے دل کا پتھر رکھ لیا

وہ جو اُڑ کر جا چکا ہے دُور میرے ہاتھ سے
اُس کی اِک بچھڑی نشانی، طاق میں پر رکھ لیا

دید کی جھولی کہیں خالی نہ رہ جائے عدیم
ہم نے آنکھوں میں ترے جانے کا منظر رکھ لیا

پھینک دیں گلیاں برونِ صحن سب اُس نے عدیم
گھر کہ جو مانگا تھا میں نے، وہ پسِ در رکھ لیا

کیوں مرے لب پہ وفاؤں کا سوال آجائے
یہ بھی ممکن ہے اُسے خود ہی خیال آجائے

ہجر کی شام بھی سینے سے لگا لیتا ہوں
کیا خبر یونہی کبھی شامِ وصال آجائے

گھر اسی واسطے جنگل میں بدل ڈالا ہے
شاید ایسے ہی اِدھر میرا غزال آجائے

دھنک اُبھرے سرِ افلاک کڑی دھوپ میں بھی
دشتِ وحشت میں اگر تیرا خیال آجائے

کوئی تو اُڑ کے دہکتا ہوا سورج ڈھانپے
گرد ہی سر پہ گھٹاؤں کی مثال آجائے

چھوڑ دے وہ مجھے تکلیف میں ممکن تو نہیں
اور اگر ایسی کبھی صورتِ حال آ جائے

اُس گھڑی پوچھوں گا تجھ سے یہ جہاں کیسا ہے
جب ترے حُسن پہ تھوڑا سا زوال آ جائے

کچھ نہیں ہے تو بھلانا ہی اُسے سیکھ عدیم
زندگی میں تجھے کوئی تو کمال آ جائے

وہ رہا خاموش تو یہ طور بھی اچھا لگا
بات کی اُس نے تو وہ کچھ اور بھی اچھا لگا

اُس کے چہرے پر بہت سجتے تھے کالے بال بھی
اُس کے بالوں کا سُنہری دَور بھی اچھا لگا

کامیابی کامیابی چار سُو ہر چار سُو
نام اپنا صرف زیرِ غور بھی اچھا لگا

میں زمینِ پاک سے ہوں مجھ کو امریکہ میں بھی
اِک شکاگو ہی نہیں لاہور بھی اچھا لگا

یہ تلوّن ہے کہ وسعت ہے محبّت کی عدیمؔ
وہ لگا اچھا تو کوئی اور بھی اچھا لگا

یہ تعصّب ہے کہ شدّت ہے محبّت کی عدیمؔ
وہ لگا اچھا تو اُس کا جور بھی اچھا لگا

آج آسانی ملی ہے مجھ کو تھوڑی سی عدیمؔ
آج وہ دُشواریوں کا دَور بھی اچھا لگا

جب کہا اُس کو، پلٹ کر وہ مکیں آیا نہیں
بات اُس نے مان لی، اُس کو یقیں آیا نہیں

بے چمک سی اِک نمی آنکھوں میں پھیلی رہ گئی
اشک پلکوں پر کوئی مثلِ نگیں آیا نہیں

ریت تڑپی بھی سرِ صحرا بگولے اوڑھ کر
کوئی بھی چشمہ مگر زیرِ زمیں آیا نہیں

احتیاطِ خاص اُس کے پیار میں شامل رہی
وہ قریں آیا مگر اتنا قریں آیا نہیں

سات برسوں کی جدائی اور پھر ملنا عدیم
زندگی میں کوئی پل اِتنا حسیں آیا نہیں

O

وہ آج گھر میں ہمارے کہاں سے آ نکلے
سحر کے وقت ستارے کہاں سے آ نکلے

یہ کس نے ہاتھ پریشانیوں میں تھام لیا
سمندروں میں کنارے کہاں سے آ نکلے

گروہِ سنگدلاں میں گھرا ہوا تھا میں
یہ بیچ میں مرے پیارے کہاں سے آ نکلے

ضرورتوں میں نہ تھا کوئی پوچھنے والا
عزیز آج ہمارے کہاں سے آ نکلے

جو بے کسی کا زمانہ تھا وہ تو بیت گیا
اچانک اتنے سہارے کہاں سے آ نکلے

یہاں تو برف تھی چشمے کو پھوٹنا تھا یہاں
دہکتی آگ کے دھارے کہاں سے آ نکلے

عدیمؔ بات محبّت کی ہو رہی تھی ابھی
یہ دل پہ درد کے آرے کہاں سے آ نکلے

عدیمؔ تو نے کہا تھا وہ طفل کھو بھی گیا
پھر آج گھر میں غبارے کہاں سے آ نکلے

۳ ملوں کسی سے وہی درمیان رہتا ہے
وہ جو ملا ہی نہیں اس کا دھیان رہتا ہے

چھپیں کہاں سے حسد کے دیئے ہوئے گھاؤ
جلے ہوئے کا تو اکثر نشان رہتا ہے

ہزار بار بگولے اُڑا کے لے جائیں
رواں کوئی نہ کوئی کارواں رہتا ہے

وہی ہیں چاند ستارے ہزار صدیوں سے
زمیں کے سر پہ وہی آسمان رہتا ہے

۴ یقین آتا نہیں اُس کی بے وفائی کا
وہ آ ہی جائے گا یہ ہی گمان رہتا ہے

وہ بے وفا تو نہیں صرف خوبصورت ہے
دل اُس کے واسطے کیوں بدگمان رہتا ہے

ذرا سی عمر بڑی ہو رہی ہے ہر لمحہ
عدیمؔ دل تو ہمیشہ جوان رہتا ہے

یونہی تو پھول ہر اک سو کھلے نہیں ہیں عدیمؔ
یہیں کہیں وہ مرا مہربان رہتا ہے

غمِ حیات اُٹھا کے بھی جی رہا ہوں عدیمؔ
کوئی بہت ہی بڑا امتحان رہتا ہے

ہ

۱۳ پتھر ہے تیرے ہاتھ میں یا کوئی پھول ہے
جب تو قبول ہے تیرا سب کچھ قبول ہے

پھر تُو نے دے دیا ہے نیا فاصلہ مجھے
سر پر ابھی تو پچھلی مسافت کی دھول ہے

۱۴ تُو دِل پہ بوجھ لے کے ملاقات کو نہ آ
ملنا ہے اس طرح تو بچھڑنا قبول ہے

تُو یار ہے تو اِتنی کڑی گفتگو نہ کر
تیرا اُصول ہے تو مرا بھی اُصول ہے

۱۵ لفظوں کی آبرو کو گنواؤ نہ یوں عدیم
جو مانتا نہیں اُسے کہنا فضول ہے

○

کیوں میری صداؤں کا اثر کوئی نہیں ہے
ایسا تو نہیں ہے کہ اُدھر کوئی نہیں ہے

کیوں روح کی پرواز دکھائی نہیں دیتی
یہ کیسا پرندہ ہے کہ پَر کوئی نہیں ہے

ساکن ہے، مسافر ہے، ہوا ہے کہ خدا ہے
رہتا ہے وہ ہر شہر میں گھر کوئی نہیں ہے

طوفانِ بلا کوئی اُمڈنے کو ہے شاید
پھر آج سرِ راہگذر کوئی نہیں ہے

قدموں کا تحرک ہی نہیں ضامنِ منزل
کیا پائیں اگر سمتِ سفر کوئی نہیں ہے

تعداد جو دیکھوں تو ہزاروں ہی چھتیں ہیں
رہنے کے لیے شہر میں گھر کوئی نہیں ہے

پاگل ہے عدیمؔ اُس کے لیے سارا زمانہ
صُورت کے سوا جس میں ہُنر کوئی نہیں ہے

- دُور سے ہنستا رہا میرے قریں آیا نہیں
لاکھ سمجھایا مگر اس کو یقیں آیا نہیں

- مدّتوں آتی رہی ہے جس کے قدموں کی صدا
میں نے سمجھا آ گیا، لیکن نہیں آیا نہیں

یہ جہاں ہے یا مکاں آسیب میں ڈوبا ہوا
جو مکیں گزرا یہاں سے وہ مکیں آیا نہیں

- آ بسا وہ شخص آکر اور ہی گھر میں عدیمؔ
تیر واپس آ گیا لیکن وہیں آیا نہیں

- ہر جگہ ہیں یادگاریں اُس کے وعدوں کی عدیمؔ
ہر جگہ اُس نے کہا لیکن کہیں آیا نہیں

صحرا میں پھول اور گلستاں میں دھول ہے
جو چیز ہے یہاں وہ خلافِ اصول ہے

خوابِ چمن نما تری تعبیر کیا ہوئی
دیکھا تو تھا گلاب، کھلا تو ببول ہے

اپنی وفا نبھا کے پشیمان ہے وہ یوں
جیسے وفا بھی کوئی جوانی کی بھول ہے

اُس سمت کائنات کے دیکھوں تو کس طرح
رستے میں بے شمار ستاروں کی دھول ہے

یہ وقت وہ ہے جبکہ انا، موم ہو چکی
اس وقت کوئی آئے کوئی بھی قبول ہے

آکے ہنسی لبوں پہ بکھر بھی گئی عدیم
جانے زیاں ہے یہ کہ خوشی کا حصول ہے

○

پھر وہی لہریں وہی لہروں کا گھر آ جائے گا
پھر اُٹھاؤں گا میں کشتی پھر بھنور آ جائے گا

پھر سے چہرہ عزم کا تیرے گا طوفانوں کے بیچ
پھر اسی چہرے سے طوفانوں کو ڈر آ جائے گا

کھِل کے جھڑ جائیگا جب یہ رات کا کالا گلاب
تب اسی ٹہنی پہ سُورج کا ثمر آ جائے گا

رات کا مطلب ہمیشہ کا اندھیرا تو نہیں
روشنی ہو جائے گی ، وقتِ سحر آ جائے گا

پھر دریچے سے وہ جھانکے گا بڑی حیرت کیساتھ
پھر بڑی تیزی سے وا کرنے وہ در آجائے گا

کیسے رشتے کیسے ناتے کون سے بندھن عدیمؔ
جس کو آنا ہے وہ سب کچھ چھوڑ کر آجائے گا

پھول کمرے میں سجا ہی ہو تو اچھا ہے عدیمؔ
کہہ تو ڈالا ہے نہیں اُس نے مگر آجائے گا

کیا خبر تھی پھر نیا وقتِ سفر آ جائے گا
میں تو سمجھا تھا سفر کے بعد گھر آ جائے گا

اس غلط فہمی میں تنہا منزلیں طے ہو گئیں
چل پڑوں گا میں تو کوئی ہمسفر آ جائے گا

اتنی بے پروائیوں سے بھُولنا اچھا نہیں
یہ ہُنر ہے تو ہمیں بھی یہ ہُنر آ جائے گا

جب نہیں ملنا نصیبوں میں تو یوں ہو گا عدیم
میں اُدھر جاؤں گا جس دن وہ اِدھر آ جائے گا

ہولے ہولے اُس کی تعریفیں کیے جاؤ عدیم
آتے آتے آپ ہی وہ راہ پر آ جائے گا

اُٹھ بدل ہی ڈال کپڑے اور مُنہ دھو لے عدیم
تُو نے جب سوچا نہیں، اُس دن وہ گھر آ جائے گا

○

وہ تعلق توڑ کر بھی مہربانی کر گیا
ربط جو فانی تھا اس کو غیر فانی کر گیا

میں تو سمجھا تھا کہ مل کر داستاں پوری ہوئی
وہ بچھڑ کر پھر بڑی لمبی کہانی کر گیا

دل نے من میں درد کی گہری لکیریں کھینچ دیں
گھر کا بچہ گھر کی دیواریں پرانی کر گیا

دھوپ اتنی تیز کیکر بھی لگا برگد کا پیڑ
گدھ بھی منڈلایا تو سر پر سائبانی کر گیا

سب کی سب لہریں چمک اٹھیں ستاروں کی طرح
ڈوبتا سورج کچھ ایسے بادبانی کر گیا

اس نے اوپر کیا اٹھائیں نیلگوں آنکھیں عدیم
وہ خلا کا رنگ سارا آسمانی کر گیا

—

○

کر گیا حائل حدیں پھر سے پرانی کر گیا
میں پلٹ آیا تو وہ نقل مکانی کر گیا

دوش کس کا معذرت کیسی کہاں کی رنجشیں
وہ تو جا کر ختم ہی ساری کہانی کر گیا

- پاس تھے دل صاف تھے سب آئینے شفاف تھے
فاصلہ پیدا دِلوں میں بدگمانی کر گیا

- کیا کروں کچھ بول احساسِ ندامت کیا کروں
وہ ذرا سا رو کے مجھ کو پانی پانی کر گیا

ہو گیا خاموش وہ جاتے ہوئے لمحے عدیم
شاخ سے پتا گرا اور ترجمانی کر گیا

———

○

وہ خوشی کی صبحِ روشن وہ غموں کی شام بھی
وہ مری تکلیف بھی ہے وہ مرا آرام بھی

میں بھی تھا پس ماندگاں میں بعدِ مرگِ دوستی
جائیدادِ غم لگا دی اُس نے میرے نام بھی

وقت ہے ایمان کی بولی کا اب تو صاحبو
مُورتی کردار کی تو ہو چکی نیلام بھی

رُوح نکلی تو گزرتا وقت ساکت ہو گیا
رہ گئی جَم کر بدن میں گردشِ ایّام بھی

ڈر رہا تھا جس سے آخر آ گیا وہ دن عدیمؔ
خوف تھا جس کا بہت ہی آ گئی وہ شام بھی

- میں تو پہلے ہی بُرا ہوں میں تو ہوں بدنام بھی
تُو میرے ہی نام کر دے اپنا ہر الزام بھی

پال رکھا ہے تجھے سینے میں کینہ جان کر
اب تو گالی دے کے لیتا ہوں میں تیرا نام بھی

- تُو بتا میں کیا نبھاؤں دوستی یا زندگی
تُو بھی ہے موجود کرنے ہیں بہت سے کام بھی

اُس کی نفرت سے تو دل دُکھتا تھا پہلے ہی عدیم
اب بُرا لگتا ہے اُس کے پیار کا پیغام بھی

- کیسے خط لکھنے کے وعدے کیسی تصویریں عدیم
وہ تو شاید بھول جائے جا کے میرا نام بھی

○

بہت ہی خوش ہے زمانہ اُداس ہو کر بھی
حسوں کا قحط ہے کتنا حواس ہو کر بھی

میں اُس کو ہاتھ لگاؤں تو خود کو ہاتھ لگے
وہ میرے پاس نہیں میرے پاس ہو کر بھی

نہ میرے پاس نہ کچھ اُس کے پاس وقت عدیمؔ
ہم ایک پل نہ رُکے روشناس ہو کر بھی

دُکھوں کے پیرہنوں کی دریدگی نہ گئی
عدیمؔ دیکھ لیا خوش لباس ہو کر بھی

○

اس کی ہی مُہر پاؤں دلِ لخت لخت پر
وہ نام جو لکھا ہی نہیں لوحِ بخت پر

بیٹھا ہے کون دشت میں وحشت کے تخت پر
پھل کی جگہ بھی سنگ لگے درخت پر

مجھ کو پکارنا ہے تو پھر پیار سے پکار
میں تو نہیں رُکوں گا صدائے کرخت پر

پھر فاختہ قریب سے ہو کر گزر گئی
کرگس پھر آ کے بیٹھ گئے ہیں درخت پر

ٹکرا کے چُور چُور ہوئے آئینے عدیم
اُترا نہ کوئی عکس کسی سنگِ سخت پر

لٹکی ہوئی ہیں چاروں طرف ڈوریاں عدیم
پُتلی کہاں سے بیٹھ گئی دل کے تخت پر

O

چھپا نہ رہنے دیا ماہتاب میں نے بھی
اُٹھا کے دیکھ لیا ہے نقاب میں نے بھی

پلٹ کے اُس کو دیا ہے جواب میں نے بھی
چکا دیا ہے کچھ اب کے حساب میں نے بھی

محبتوں کا سبق نفرتوں سے یاد نہ کر
پڑھی ہوئی ہے بہت یہ کتاب میں نے بھی

وہ اپنے واسطے کوشش میں مبتلا تھا بہت
اُسی کو ہونے دیا کامیاب میں نے بھی

وہ بہہ رہا تھا مرے آنسوؤں کے دریا میں
عدیمؔ روکا نہیں سیلِ آب میں نے بھی

ہر ایک شاخ نے کانٹوں کے تیر برسائے
عدیمؔ چوم کے چھوڑا گلاب میں نے بھی

○

نظریں ملیں تو پیار کا اظہار کر گیا
بولا تو بات بات سے انکار کر گیا

آنکھوں نے خشت خشت چنی رات کی فصیل
خورشیدِ صبح پھر اسے مسمار کر گیا

جتنا اُڑا ہوں اتنا فلک بھی ہُوا بلند
کون اس قفس میں مجھ کو گرفتار کر گیا

بن بن کے پانیوں کے بھنور ٹوٹتے گئے
میں ڈوبتا ہوا بھی ندی پار کر گیا

ورنہ یہ بوجھ کون اٹھاتا تمام عمر
اچھا ہُوا کہ پہلے وہی وار کر گیا

میں لفظ ڈھونڈ ڈھونڈ کے تھک بھی گیا عدیم
وہ پھول دے کے بات کا اظہار کر گیا

○

یاد کرنے کو تو کرتا ہوں میں نفرت اُس کی
دل سے مٹتی ہی نہیں پھر بھی محبت اُس کی

بھید چاہت کا کھلا مجھ پہ تو معلوم ہوا
عمر بھر کرتا رہا میں تو عبارت اُس کی

مجھ میں لگتا ہے کہ مجھ سے بھی زیادہ وہ ہے
خود سے بڑھ کر مجھے رہتی ہے ضرورت اُس کی

میں اِسی خوف سے رو دیا نہ کبھی کھُل کے عدیم
ڈوب جائے نہ میری آنکھ میں صورت اُس کی

وہ بہت شوق سے آیا تھا مجھے ملنے کو
اور میں کر نہ سکا کوئی بھی خدمت اُس کی

جب سے معلوم ہوئی مجھ کو حقیقت اُس کی
بڑھ گئی دل میں میرے اور بھی عزت اُس کی

○

ایسا جنوں ہے کہیں ایسی مثال ہے کوئی
مچھلی پکارنے لگے دریا میں جال ہے کوئی

آئینہ نواح میں اپنا ہی عکس چار سُو
اوجِ کمال پہ بتا یہ بھی کمال ہے کوئی

عہد وفا بتا مجھے ہوس کا کیا کروں
ہونٹوں پہ کوئی نام ہے دل میں خیال ہے کوئی

آپ نے ٹھیک ہی کیا میں ہی وفا نہ کر سکا
یہ تو سوال ہو چکا اور سوال ہے کوئی

مجھ پہ یہ مہربانیاں اتنا وہ مہرباں کیوں
اس میں بھی کچھ فریب ہے اس میں بھی چال ہے کوئی

میں نے عدیمؔ جو کیا اس کی رضا سے ہی کیا
اپنی رضا سے کچھ کروں میری مجال ہے کوئی

صاحب ہے ہنر کے ساتھ کیسا کوئی مقابلہ
آئے عدیمؔ سامنے جس میں کمال ہے کوئی

O

دیوار مطمئن ہے تو در مطمئن نہیں
پوری طرح سے کوئی بھی گھر مطمئن نہیں

صحرا میں دیکھئے تو بگولے ہیں مُضطرب
دریا میں جھانکیے تو بھنور مطمئن نہیں

آئی ہوا تو پیڑ نے جھاڑی ہے شاخ شاخ
اپنے ثمر سے خود ہی شجر مطمئن نہیں

منزل دِکھا رہا ہے لرزتی کرن کے ساتھ
جیسے چراغِ راہگذر مطمئن نہیں

کب تک یہ اشکِ خُونِ جگر سے بنیں گے لعل
ان موتیوں سے دیدۂ تر مطمئن نہیں

اپنا بتا کہیں پہ ہوس کی حدیں بھی ہیں
بن کر خدا ابھی کوئی بشر مطمئن نہیں

ہر ایک پل زمیں پہ بکھرنے کا خوف ہے
آنکھوں کی سیپیوں میں گہر مطمئن نہیں

مغرب کی سمت پھینک دیا اس کو بھی عدیم
اس آفتاب سے بھی سحر مطمئن نہیں

یہ چپ عدیم ایک عجیب اضطراب ہے
لگتا تو مطمئن ہوں مگر مطمئن نہیں

○

تتلی تھی زرد سُرخ تھا چہرہ گلاب کا
اِتنا سا عکس آنکھ میں باقی ہے خواب کا

دیکھا جو رنگ رات کی صورت نقاب کا
چہرے نے روپ دھار لیا ماہتاب کا

ہاتھوں میں آ کے وقت کی مچھلی پھسل گئی
لمحے میں کٹ گیا ہے زمانہ شباب کا

سب کچھ ہے پاس پھر بھی نہیں قوّتِ خرید
بچّے کو ضد کہ لُوں گا غبارہ حباب کا

جس پر چھپا ہوا تھا مِرا نام تیرے ساتھ
دیمک نے کھا لیا وہ ورق ہی کتاب کا

یہ سوچ کر لکھا ہی نہیں خط اُسے عدیم
میں انتظار کیسے کروں گا جواب کا

تتلی ہی صرف گود میں بیٹھی نہیں عدیم
کانٹوں کے ساتھ بھی ہے تعلق گلاب کا

غزل (۱۰)

پھر اُس کے بولنے کا طریقہ بدل گیا
لگتا ہے پھر سے اُس کا ارادہ بدل گیا

اپنا یہ حال ہے کہ ہمیشہ کیا یقیں
اُس کا کمال ہے وہ ہمیشہ بدل گیا

تُو نے فریب ہی تو دیا ہے فقط مجھے
کیوں مجھ کو دیکھ کر ترا چہرہ بدل گیا

آسودہ حال گھر کے کسی طفل کی طرح
دل بھر گیا تو اُس کا کھلونا بدل گیا

اب یوں کہ مسکرا کے بچھڑنے لگے ہیں لوگ
اب عہد توڑنے کا طریقہ بدل گیا

بھٹکے ہوئے ہی ساری مسافت گزار دی
منزل بدل گئی کبھی رستہ بدل گیا

اقرار ہی تو صرف حقیقت نہیں کوئی
انکار سُن کے کیوں ترا چہرہ بدل گیا

سوچا تو اور کچھ تھا مگر یوں ہوا عدیم
اُس پر نظر پڑی تو ارادہ بدل گیا

* جھومتی ٹہنی پر اس کا ہمنوا ہو جاؤں میں
وہ اگر ہے پھول تو بادِ صبا ہو جاؤں میں

* وادیوں میں جھومتی گاتی گھٹا ہو جائے وہ
لہلہاتے کھیت کی تازہ ہوا ہو جاؤں میں

* اُس کے چہرے پر بکھیروں اپنی کرنیں رات بھر
اُس کے آنگن میں کوئی جلتا دیا ہو جاؤں میں

ہر کسی کا ایک سا کردار تو ہوتا نہیں
بے وفا ہے وہ تو کیسے بے وفا ہو جاؤں میں

انکسار اِک میرا اخلاقی فریضہ ہے عدیمؔ
اس کا مطلب یہ نہیں ہے گردِ پا ہو جاؤں میں

وہ پجارن بن کے کیا گزری پہاڑوں سے عدیمؔ
ہر کوئی پتھر پکارا دیوتا ہو جاؤں میں

○

پلٹ کر آنکھ نم کرنا مجھے ہرگز نہیں آتا
گئے لمحوں کا غم کرنا مجھے ہرگز نہیں آتا

پیمبر کوئی پنہاں ہو ترے دل میں تو پنہاں ہو
ستمگر پر کرم کرنا مجھے ہرگز نہیں آتا

میں دہشت گرد ہوتا تو اُسے برباد کر دیتا
مگر اُس پر ستم کرنا مجھے ہرگز نہیں آتا

سرِ تسلیم خم کر کے بہت کچھ مِل تو سکتا ہے
سرِ تسلیم خم کرنا مجھے ہرگز نہیں آتا

محبّت ہو تو بے حد ہو جو نفرت ہو تو بے پایاں
کوئی بھی کام کم کرنا مجھے ہرگز نہیں آتا

میں اِک اِک بوند کے پیچھے نہ بھاگا ہوں نہ بھاگوں گا
سمندر یُوں بہم کرنا مجھے ہرگز نہیں آتا

عدمؔ انساں کی آنکھوں میں تو دُنیا دیکھ سکتا ہوں
سُبو کو جامِ جم کرنا مجھے ہرگز نہیں آتا

○

تعلق توڑ کر اس کی نئی بنیاد رکھنا ہے
اُسی کو بھُول جانا ہے اُسی کو یاد رکھنا ہے

یہ دل طوفاں اُٹھاتا ہے تو یہ بھی بھول جاتا ہے
کسے برباد کرنا ہے کسے آباد رکھنا ہے

وہ لمحہ طیش کا ساری کہانی پر مُسلّط ہے
ستم یہ ہے اسے بھی شاملِ رُوداد رکھنا ہے

ہمیشہ عرض کرنا بھی ندامت کی علامت ہے
ذرا سا حکم بھی اب کے پسِ فریاد رکھنا ہے

وفاداروں کے چہروں کی نمائش ہی نہیں کرتی
وہ جس نے ساتھ چھوڑا تھا اُسے بھی یاد رکھنا ہے

یہ دل پنچھی جو اس کی قید میں جائے تو زندہ ہو
اور اُس کا فیصلہ یہ ہے اِسے آزاد رکھنا ہے

عدیم ایسی محبّت سے میں اچھا بے محبّت ہی
اگر ناشاد رہ کر ہی کسی کو شاد رکھنا ہے

بدن زنجیر ہوتا ہے تو ہو جائے عدیم اپنا
یہ دل آزاد ہے اس کو سدا آزاد رکھنا ہے

○

— تعلق توڑتا ہوں تو مکمّل توڑ دیتا ہوں
جسے میں چھوڑ دیتا ہوں اُسے میں چھوڑ دیتا ہوں

— محبّت ہو کہ نفرت ہو بھرا رہتا ہوں شدّت سے
جدھر سے آئے یہ دریا اُدھر ہی موڑ دیتا ہوں

— یقیں رکھتا نہیں ہوں میں کسی کچّے تعلق پر
جو دھاگہ ٹوٹنے والا ہو اُس کو توڑ دیتا ہوں

مرے دیکھے ہوئے سپنے کہیں لہریں نہ لے جائیں
گھروندے ریت کے تعمیر کر کے چھوڑ دیتا ہوں

میں شیشہ گر نہیں آئینہ سازی تو نہیں آتی
جو دِل ٹوٹے تو ہمدردی سے اس کو جوڑ دیتا ہوں

ندیمؔ اب تک وہی بچپن وہی تخریب کاری ہے
قفس کو توڑ دیتا ہوں پرندے چھوڑ دیتا ہوں

○

۱۔ کیوں نہ ہم اُس کو اُسی کا آئینہ ہو کر ملیں
بے وفا ہے وہ تو اُس کو بے وفا ہو کر ملیں

۲۔ تلخیوں میں ڈھل نہ جائیں وصل کی اکتاہٹیں
تھک گئے ہو تو چلو پھر سے جدا ہو کر ملیں

۳۔ پہلی پہلی قربتوں کی پھر اٹھائیں لذتیں
آشنا آ پھر ذرا نا آشنا ہو کر ملیں

ایک تو ہے سر سے پا تک ہے انکسار
لوگ وہ بھی ہیں جو بندوں سے خدا ہو کر ملیں

۔ معذرت بن کر بھی اس کو مل ہی سکتے ہیں عدیم
یہ ضروری تو نہیں اُس کو سزا ہو کر ملیں

○

اُبھری سحر کی شکل بھکاری کی آنکھ میں
پنچھی کا عکس جیسے شکاری کی آنکھ میں

بیٹھا ہے باز ہاتھ میں چڑیا لیے ہوئے
کیسی چمک ہے راجکماری کی آنکھ میں

وہ تو خدا ہے اُس کا تو درجہ ہی اور ہے
پتھر بھی دیوتا ہے پُجاری کی آنکھ میں

اچھّا بُرا تو سب ہے توازن کے واسطے
کردار سب ہیں ایک لکھاری کی آنکھ میں

کوئی بہت بڑی ہی خوشی پائی ہے عدیمؔ
بھالو سے ناچتے ہیں مداری کی آنکھ میں

—